انتخاب اردو اور اردو کا نصاب ۔ شائع کردہ دی یونیورسٹی آف بمبئی، کاغذ اچھا

ٹائپ، قیمت فی جلد ہے

اردو نظم و نثر کا یہ انتخاب اور نصاب بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے انٹر میجیٹ کے آرٹس، سائنس اور کامرس کے طالب علموں کے لیے مرتب کیا گیا ہے، حصۂ نظم میں غزلیں نظمیں، قطعات، رباعیات، قصائد اور مراثی تمام اصناف سخن کا انتخاب ہے، انتخاب کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ ایک انتخاب ہر حیثیت سے مکمل کہا جا سکے، لیکن یہ انتخاب خوش مذاقی اور سلیقہ سے کیا گیا ہے، اور مجموعی حیثیت سے اچھا ہے۔

خدا ہے ۔ از جناب مولوی سید حامد علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰ قیمت ۷۵ نئے پیسے، پتہ ادارہ شہادت حق (وقف) بریلی (یو، پی)

اس مختصر رسالہ میں علمی و عقلی دلائل سے خدا کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ خدا کے انکار کے بعد کائنات کی کوئی توجیہ ہی نہیں ہو سکتی، اسی موضوع پر اور جو مضامین اور رسالے لکھے گئے ہیں، ان سب میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اور اس قابل ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کیجائے،

الجامعۃ الاسلامیہ ۔ از جناب ہلال عثمانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲ قیمت تحریر نہیں، ناشر کتب خانہ محمودیہ، دیوبند (یو پی)

اس رسالہ میں ہلال عثمانی صاحب نے جو دار العلوم دیوبند کی جانب سے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مدینہ یونیورسٹی کا اجمالی تعارف کرایا ہے، یہ یونیورسٹی ابھی نئی ہے اس لیے اس کے حالات سے عام طور سے ناواقفیت ہے، اس لحاظ سے یہ رسالہ مفید ہے،

"ض"

جلد ۹۱ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۳ء - عدد ۳

مضامین

شذرات

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی موت ہندوستان کا ایک بڑا قومی حادثہ ہے، وہ اپنے قومی و ملکی خدمات کے لحاظ سے صف اول کے لیڈروں میں تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں انکے بڑے کارنامے ہیں، چمپارن کی مشہور ستیہ گرہ کے گویا ہیرو تھے، وہ گاندھی جی کے خاص تربیت یافتہ اور ان کے معتمد علیہ تھے، ان میں ان کی بہت سی اخلاقی خوبیاں موجود تھیں، جو آخر تک قائم رہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس کے بہت سے لیڈروں کے خیالات اور کردار میں جو تبدیلی ہو گئی ہے، ان سے ان کا دامن محفوظ تھا، وہ کانگریس کے پرانے اصولوں پر برابر قائم رہے، اور اپنے جلیل القدر عہدے کی ذمہ داریوں کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ نباہا، طبعاً بڑے شریف اور مرنجاں مرنج تھے، اور قومی و ملکی معاملات میں ان کا دل بہت وسیع تھا، اس لیے کسی طبقہ کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی، وہ پرانے کایستھ تھے اس لیے اردو اور فارسی سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے، اور بہت شستہ اردو بولتے اور لکھتے تھے، اور ان میں قدیم مشترک تہذیب کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں، اس لیے ان کی موت مختلف حیثیتوں سے بڑا قومی سانحہ ہے، اور ان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہم نے گذشتہ معارف میں جامعہ ملیہ کو اردو یونیورسٹی بنانے کی جو تجویز پیش کی تھی، اردو پریس نے اس کی پذیرائی کی، متعدد اہم اخبارات نے معارف کے شذرات تائیدی نوٹ کے ساتھ نقل کیے۔ قومی آواز نے لیڈنگ آرٹیکل لکھا، اس کی تائید سب سے اہم ہے، مولوی حیات اللہ صاحب انصاری اردو لسانی تحریک کے ممتاز

لیڈروں میں ہیں، اور اس راہ میں ان کی بڑی خدمات ہیں، مگر ابھی انجمن ترقی اردو ہند کی رائے نہیں معلوم ہو سکی جن کا سب سے زیادہ انتظار تھا، یہ تحریک تو در حقیقت اسی کی جانب سے ہونی چاہیے تھی، لیکن اگر کسی سبب سے نہیں ہو سکی تو تائید کی توقع تو اس سے بہر حال ہے[1]، جامعہ والوں کا رد عمل بھی نہیں معلوم ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض دشواریاں بھی ہیں، مگر کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس پر قابو نہ حاصل کیا جا سکے۔

اس تجویز کے سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آیندہ چل کر ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں گی، گو اردو کا وطن قریب قریب سارا ہندوستان ہے، دلی، اتر پردیش اور بہار اس کے خاص مرکز ہیں، لیکن یہ اس کی بد قسمتی ہے کہ اس کا کہیں ٹھکانا نہیں، جہاں اس کو وہی سہولتیں حاصل ہوں جو دوسری زبانوں کو حاصل ہیں، اس کو دو ہی صوبے پناہ دے سکتے تھے، دلی اور اتر پردیش، اتر پردیش کا حال ظاہر ہے، لے دے کے ایک دلی رہ جاتا ہے، جو مرکز ہونے کی وجہ سے اردو نواز صوبائی حکومتوں کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اگر اس کو یہاں بھی پناہ نہ ملی تو اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا؛

جامعہ پر کئی حیثیتوں سے اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، ایک تو وہ اردو کے سب سے قدیم اور اہم مرکز اور ہندوستان کے پایۂ تخت میں ہے، دوسرے اس کو اردو کے ساتھ ہمیشہ سے ایک خاص خصوصیت رہی ہے، ان سب سے بڑھ کر اس کے پاس ہر قسم کے ذرائع ہیں، اور بظاہر اس راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے، اور اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو ظاہر کرنا چاہیے، ہمارے خیال میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، دیکھنا یہ ہے کہ جامعہ اس امتحان میں کہاں تک پوری اترتی ہے، جامعہ کے اردو یونیورسٹی بن جانے سے پورا نہ سہی اردو کے تحفظ و بقا کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہو جائے گا، اور خود جامعہ کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائیگا۔

---

[1] کاپی چھپنے کے بعد انجمن کی رائے بھی معلوم ہو گئی، جو معارف کی تائید میں ہے۔

ورنہ عام یونیورسٹیوں کی طرح اس کے محض ایک یونیورسٹی بنجانے سے اس کا امتیازی وصف کیا رہ جائیگا
یہ بھی شبہہ ہے کہ دلی میں ایک یونیورسٹی کی موجودگی میں دوسری یونیورسٹی کہاں تک چل سکے گی
اس لیے اس حیثیت سے بھی اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کی عمومی تعلیم میں ضرور ترقی ہوگئی ہے، مگر عام شکایت یہ ہے کہ علمی
اور تعلیمی معیار بہت گر گیا ہے، جس کا ثبوت ہر شعبہ میں ملتا ہے، آجکل کے گریجویٹ پرانے میٹرک کے مقابلہ
میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اور اپنی مادری زبان تک کی دو چار سطریں صحیح نہیں لکھ سکتے، ان کے عام
معلومات کا جو حال ہے وہ پبلک سروس کمیشن کے سوالات کے جوابات سے معلوم ہوتا رہتا ہے، طلبہ کی
تربیت اور اخلاقی حالت کے ثبوت کے لیے ان کے آئے دن کے ہنگامے کافی ہیں، پہلے یونیورسٹیاں
علم و فن کے ایسے اساطین کو اعزازی ڈگریاں دیتی تھیں، جن کی ذات پر خود ڈگریوں کو فخر ہوتا تھا، اور اب
وہ بھی سرکاری خطابات کی طرح وزرا، عمال حکومت اور دوسرے اصحاب جاہ و اقتدار کی دنیاوی
وجاہت کی سند اور ان کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہیں،

یہی حال ہندوستان کی سب سے بڑی علمی مجلس ساہتیہ اکیڈمی کے انعامات کا ہے، اس انعام کا مقصد تو
یہ ہے کہ جس کتاب کو انعام دیا جائے وہ اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہو، دوسری زبانوں کا تو حال معلوم نہیں،
مگر اردو کی ایسی کتابوں کو بھی انعام ملے ہیں، جو کسی حیثیت سے بھی اس کی مستحق نہیں تھیں، اسکے اسباب
جو بھی ہوں لیکن اس سے ساہتیہ اکیڈمی کا معیار گرتا ہے، اس علمی و تعلیمی انحطاط کا نتیجہ یہ ہے کہ غلامی کے
دور کی تعلیم میں ہندوستان میں ہر علم و فن کے جیسے ماہرین اور اصحاب کمال پیدا ہوئے، اب
اس کی قطعاً امید نہیں،

مقالات

دبستان المذاہب کا مصنف

از جناب پروفیسر حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے الہ آباد یونیورسٹی

[یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تیسری آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ ۲۶-۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء
کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا اور اب پہلی مرتبہ قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے]

قرون وسطیٰ کے ہندوستانی ادب میں دبستان المذاہب کا وہی مقام ہے جو صدر اول کے کلامی ادب
میں امام عبدالکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا ہے، بلکہ غالباً اس سے زیادہ کیونکہ امام شہرستانی کی
الملل والنحل، امام عبدالقاہر بغدادی کی الفرق بین الفرق کا تفصیلی تکملہ ہے، جو تاریخ فرق سے زیادہ تنقید
و مناظرہ کی کتاب ہے، دوسرے اس کتاب میں اکثر ان فرقوں کا حال مندرج ہے جو مصنف کے زمانہ
سے بہت پہلے ختم ہو چکے تھے، اس لیے اس کے مطالعہ سے خود مصنف کے عہد کے مذہبی رجحانات کا
پتہ لگانے میں کوئی مدد نہیں ملتی، اس کے برخلاف دبستان المذاہب کے مصنف نے صرف مختلف ادیان
و مذاہب کی تعلیمات ہی کے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے اور ان پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے میں حد درجہ احتیاط برتی
ہے، چنانچہ وہ مقدمہ میں لکھتا ہے:-

"دریں نامہ موسوم بہ دبستان نختے از دانش و کنش و کیش پاستانی گروہ و گفتار و کردار باز پسیں
انبوہ از آشکار اشناسان و نہان بین صورت پرست و معنی گزیں بے کم و کاست و بغض و حسد

واثبات وابطال گزارده آمد" (دبستان المذاہب مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۲ھ ص ۲)

اسی طرح تعلیم نخست در معرفت عقائد پارسیاں کے خاتمہ پر لکھتا ہے:-

"این سرے تفصیل عقائد پارسیاں کہ در آغاز نامہ نوید گزارش آں دادہ آمد، درین بیان اصلاً سخنے اگر جز از کتاب این گروہ و زبان این فرقہ شنیدہ شدہ بود ننیاوردہ زیرا کہ بسا سخن باشد کہ دشمن از مخاصمت بر ایشان بندد۔" (ایضاً ص ۱۰۵)

اس کے ساتھ یہ کتاب سولہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے مذہبی رجحانات اور فکری تحریکات کا بڑا قابل اعتماد ماخذ ہے، بدایونی نے بھی اپنے عہد کے الحاد و بیدینی کا نقشہ کھینچا ہے، مگر اس کا بیان محض ایک متاثر شخص کی شکوہ طرازی کی حیثیت رکھتا ہے، مثلاً جلد دوم میں لکھتے ہیں:-

"بدبختے چند از ہندوان و مسلمانان ہند و مزاج قدح صریح بر نبوت می کردند۔"

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۵)

اسی طرح اسی جلد میں دین الٰہی کے پیرووں کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"در ہر رکنے از ارکان دین و ہر عقیدہ از عقائد اسلامیہ چہ از اصول و چہ فروع مثلاً نبوت و کلام و رویت و تکلیف و تکوین و حشر شبہات گوناگوں بہ تمسخر و استہزا آوردہ۔"

(ایضاً ص ۳۰۷)

خود ملا صاحب کو اپنے مذہبی تعصب اور دینی تصلب کا احساس تھا، چنانچہ جلد سوم کے خاتمہ پر فرمایا ہے:-

"آفرین و نفرین من ہمہ بدستور شرع مبین و مدح و ذم بتقریب تعصب در دین است۔"

(جلد سوم ص ۳۹۱)

جو کچھ بدایونی نے لکھا ہے صاحب دبستان المذاہب نے بھی اس کی حرف بحرف تائید کی

مگر واقعات کے ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے اور یہی غیر جانبداری اس کتاب کی تاریخی افادیت کی ضامن ہے،

لیکن یہ بات بھی انتہائی افسوسناک ہو کہ جس مصنف نے اس عظیم تاریخی خدمت کو انجام دیا خود تاریخ نے اس کی کوئی خدمت نہیں کی، حتیٰ کہ اس کا نام بھی بھلا دیا، اور اس کے زندگی بھر کے سرمایہ کو دوسروں کے نام منسوب کر دیا، عرصہ تک یہ کتاب محسن فانی کی تصنیف سمجھی جاتی رہی، حالانکہ اصل مصنف میر ذوالفقار علی الحسینی الاردستانی المتخلص بہ موبد ہے۔ اس غلط فہمی کا باعث غالباً یہ ہوا کہ اس کتاب کے دو قلمی نسخوں میں (جن میں سے ایک بمبئی میں ملا فیروز کی ملکیت میں تھا اور دوسرا شاہان اودھ کے کتب خانے میں) حمد و نعت کے بعد حسب ذیل رباعی

عالم چو کتابیست پُر از دانش و داد صحاف قضا جلد او بود معاد
شیرازہ شریعت و مذاہب اوراق امت ہمہ شاگرد و پیمبر استاد

سے قبل یہ الفاظ درج ہیں: "محسن فانی گوید" چنانچہ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا مقدمہ نگار انتھونی ٹرائر (Anthony Troyer) اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:-

As The Two copies mentioned (The one found in Bombay, The other in Lucknow) contain The same words, They can hardly be Taken for an accidental addition of The copyist. (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۱-۱۲)

دونوں نسخوں میں (جو ایک بمبئی اور دوسرا لکھنؤ میں ہے) الفاظ ایک ہی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ اس کو ایک کاتب نے اتفاقی طور سے اضافہ نہیں کیا ہو (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۱-۱۲)

حالانکہ اکثر نسخے اس حوالے سے خالی ہیں، لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اس سے اتنے بڑے مسئلے کا

فیصلہ نہیں ہو سکتا، آخر مصنف نے کتاب میں اکثر مشاہیر شعراء ماضی و حال کے اشعار دیے ہیں، کہیں ان کے نام کی تصریح کے ساتھ اور کہیں بغیر تصریح کے۔ بہرحال اگر وہ رباعی محسن فانی ہی کی ہے تو اس کے نام کی تصریح سے اس کتاب کا محسن فانی کی تصنیف ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، جبکہ شواہد اس کے خلاف ہیں، خارجی شواہد کے علاوہ داخلی قرائن سے بھی اس انتساب کی تردید ہوتی ہے۔

مستشرقین جن کا عام رجحان اس جانب ہے کہ دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف ہے، ان کے سامنے ایک دشواری بھی تھی، وہ یہ کہ خود کتاب کے اندر موبد سروش کے تذکرہ میں ایک روایت محسن فانی سے نقل کی گئی ہے:-

"از محمد محسن نام فاضلے شنیدہ شد کہ گفت من از دسی صد و شصت دلیل اثبات واجب شنیدم چوں خواستم بتحریر آورم میسر نگشت۔" (دبستان المذاہب ص ۳۳)

ظاہر ہے اگر کتاب کا مصنف خود محسن فانی ہوتا تو اس روایت کو محسن فانی سے سننے کے کیا معنی؟

بہرحال اس دشواری اور تعارض کو رفع کرنے کے لیے مستشرقین نے ایک ضعیف مفروضہ قائم کیا اور وہ مفروضہ یہ ہے کہ اس ایک زمانہ میں محسن نام اور فانی تخلص رکھنے والے ایک سے زیادہ فضلاء تھے، جن میں سے ایک دبستان المذاہب کا مصنف تھا، چنانچہ مذکور الصدر مستشرق لکھتا ہے:-

Nor can it be eonsidered strange to admil That The name of Mohsinfani was borne by more Than one individual. (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۲)

اس کا اعتراف کرنا تعجب انگیز نہیں بتایا جا سکتا ہے کہ محسن فانی کا نام ایک سے زیادہ افراد کا تھا (مقدمہ انگریزی ترجمہ ص ۱۲)

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں اتفاقات ہوا کرتے ہیں لیکن وہ قانون سے زیادہ شذ و نادر

کی حیثیت رکھتے ہیں، اور گو ایک اتفاق کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، مگر جب ایک اتفاق کے ساتھ دوسرا اتفاق بھی ضم ہو جاتا ہے تو پھر اسے تاریخ سے زیادہ افسانہ طرازی کا موضوع بننے کا حق حاصل ہو جاتا ہے، اور اتفاقات کی کثرت ان کے انکار کی مؤید ہو جاتی ہے، بہرحال یہ مفروضہ ناقابل تسلیم ہے کہ محسن نام اور فانی تخلص کے ایک سے زیادہ فضلاء دبستان المذاہب کے زمانۂ تصنیف میں موجود تھے، تاہم اسے اگر ایک مفروضہ کی حیثیت سے وقعت دی بھی جائے تو مشکل یہ ہے کہ اس عہد کے جتنے تذکرے اور تاریخیں ہیں وہ صرف ایک ہی محسن فانی کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی بیان کردہ تفاصیل تقریباً ایک ہی ہیں، آئندہ سطور اس کے باور کرنے کے لیے کافی ہوں گی کہ اس زمانہ میں محسن فانی ایک ہی فاضل جلیل کا نام تھا، اور وہ یقیناً دبستان المذاہب کا مصنف نہیں تھا، میرے اس خیال کی دو وجہیں ہیں:-

۱۔ خارجی شواہد:- محسن فانی کا تذکرہ لچھمی نرائن شفیق نے گل رعنا میں بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ان کی زندگی اور فضل و کمال کے حالات بڑی عقیدتمندی اور تفصیل سے بیان کیے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ محسن فانی ایک عالم فاضل اور معزز شاعر تھے، اور ملا یعقوب صرفی کشمیری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، علوم و فنون کی تکمیل کے بعد دہلی شاہجہاں کے دربار میں پہنچے، شاہجہاں نے ان کے علمی کمالات کی بنا پر انھیں الہ آباد کا صدر مقرر کیا، یہاں پہنچ کر انھوں نے شیخ محب اللہ الہ آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی، ملا محسن ایک عرصہ تک اسی عہدے پر فائز رہے، یہاں تک کہ شاہجہاں نے بلخ پر چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کر لیا، نذر محمد خاں والی بلخ تو فرار ہو گیا لیکن اس کی ساری جائداد جس میں ایک کتب خانہ بھی تھا شاہجہاں کے ہاتھ آئی، اتفاق سے اس کتب خانہ میں محسن فانی کا ایک دیوان ملا جس میں ایک مدحیہ قصیدہ نذر محمد خاں کی شان میں تھا، اس چیز نے شاہجہاں کے آتش غضب کو بھڑکا دیا، اس نے محسن فانی کو ملازمت سے برطرف کر دیا لیکن گزر اوقات کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا، اس کے بعد وہ اپنے وطن کشمیر واپس چلے گئے، اور بقیہ زندگی وہیں عزت و احترام کے ساتھ گزاری، کشمیر

کے اعیان و اکابر حتیٰ کہ صوبیدار بھی ان سے ملاقات کے لیے ان کے در دولت پر حاضری دیتے تھے، اور وہ خود اپنے مکان پر درس دیا کرتے تھے، ان کا معمول تھا کہ پہلے کسی مشہور مصنف کی چند عبارتوں کو پڑھکر سناتے تھے، اس کے بعد اس کی اخلاقی اور فلسفیانہ تشریح کرتے تھے، ان کی درسگاہ سے کئی باکمال فضلاء نکلے، جن میں طاہر غنی اور حاجی اسلم سالم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قدرت اللہ گوپاموی نے اپنے تذکرہ نتائج الافکار میں تقریباً یہی حالات بیان کیے ہیں:۔

"گنجینۂ فنون نکتہ دانی شیخ محمد محسن فانی کہ از اعیان کشمیر است و در فضل و کمال بے نظیر۔ تحصیل علوم و فنون از ملا یعقوب صرفی کشمیری نمود و طریق اصناف نظم نغز خوش تلاشی می پیمود۔ و بجوہر ذاتی و صفاتی مستعد بارگاہ شاہجہاں گشتہ بخدمت صدارت صوبہ الہ آباد چہرہ اعتبار افروخت و بحسن خلق و سجیہ و رضیہ در ان دیار، مرجع خاص و عام گردید و خرقہ خلافت از مولانا شیخ محب اللہ الہ آبادی پوشید۔ آخر بہ سببے از منصب و خدمت بپایۂ عزل در آمدہ و از مراحم پادشاہی تقرر سالانہ معقول کامیاب شدہ بکشمیر رفت و در انجا بہ نہایت عزت و احترام بسر می برد۔ حاکم صوبہ و اکابر شہر بملاقاتش می رفتند۔ اوقات گرامی پیوستہ بہ شغل درس و تدریس مامور میداشت و از عمدہ تدریس او اکثرے از اہل کمال مثل ملا محمد طاہر غنی و حاجی اسلم سالم علم شہرت برافراختند۔" (تذکرہ نتائج الافکار ص ۵۴۱ - ۵۴۲)

اسی طرح مسٹر طامس ولیم بیل رقمطراز ہیں:۔

شیخ محمد محسن فانی: از اکابر کشمیر و عالمے فاضل و صاحب جاہ و پاکیزہ روزگار و خوش صحبت بود، چندے در صوبہ الہ آباد خدمت صدارت داشت و صاحبقران ثانی توجہ تمام بحالش مرعی میفرمود، ہرگاہ فتح بلخ بدست سلطان مراد بخش اتفاق افتاد نذر محمد خاں تخت نشین آنجا جریدہ بگریخت و اموال وے ضبط شد۔ در کتب خانہ اش دیوان شیخ محسن

مشتمل بر مدح خان مذکور یافتند۔ از آں روز از نظر پادشاہ افتادہ بے منصب شد و از خدمت صدارت معزول گردید اما سالیانہ فراخور حالش مقرر گشت۔ بعد ازاں تا آخر عمر در کشمیر بنشستہ ہموارہ بدرس و افادہ اشتغال داشتے۔ دیوانے ترتیب دادہ ثنویہا خوب گفتہ" (مفتاح التواریخ ص ۲۵۰)

لیکن ان تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی محسن فانی کو دبستان المذاہب کا مصنف نہیں بتایا۔

دبستان المذاہب کوئی معمولی تصنیف نہیں، اس کی بڑی اہمیت ہے، نہ صرف آج بلکہ خود مصنف کے زمانے میں بھی تھی، کیونکہ آج تو ہم عہد اکبری کے مذہبی و فکری رجحانات کے لیے بدایونی کی منتخب التواریخ کو بھی اپنا ماخذ بنا لیتے ہیں لیکن اس زمانہ میں یہ کام صرف دبستان المذاہب سے لیا جاتا تھا، اس لیے اس کتاب کے ترک ذکر کو کسی اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا، اگر دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف ہوتی تو یقیناً شفیق گل رعنا میں اسکا ذکر کرتے یا کم از کم دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں اسکی تصریح ملتی۔

ب- داخلی قرائن:- محسن فانی کی زندگی کے جو حالات تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ کسی صورت سے ان حالات کے ساتھ منطبق نہیں ہوتے، جو خود مصنف دبستان نے اپنے بارے میں اس کتاب میں لکھے ہیں، اس کی پوری تفصیل باعث تطویل ہوگی، اس لیے صرف چند واقعات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے،

ا۔ مصنف دبستان لکھتا ہے کہ وہ ۱۰۳۳ھ میں صغرسنی کے عالم میں اپنے اعزہ و احباب کے ہمراہ بنارس میں گسائیں چترو پہ کی خدمت میں پہنچا تھا:۔

"گرد آورندۂ نامہ بسال ہزار و سی و سہ ہنگامیکہ از پٹنہ دوستان و خویشاں بسوئے دار الخلافہ اکبر آبادی آمدند در صغرسنی بود۔ موبد ہشیار کہ شمۂ از اوصاف جمیلہ او گذاردہ شد در آغوش خویش نزد چترو پہ برد" (دبستان المذاہب ص ۱۴۱)

یعنی ۱۰۳۳ھ میں وہ اتنا کمسن تھا کہ اس کا ایک سرپرست اسے گود میں لے کر چترو پہ برہمن کے

پاس لے گیا، غالباً اسی بنا پر مستشرقین اس کا سال ولادت ۱۰۲۵ھ کے قریب قرار دیتے ہیں، لیکن تذکرہ نگاروں کی دی ہوئی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ محسن فانی کم از کم ۱۰۰۳ھ میں سن شعور کو پہنچ چکے تھے، کیونکہ وہ ملا یعقوب صرفی کشمیری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، اور ملا موصوف کی وفات حسب تصریح بدایونی ۱۰۰۳ھ میں واقع ہوئی۔

۲۔ مصنف دبستان نے گسائیں ترلوچن کے اوصاف و کمالات کے ذیل میں ظفر خاں صوبیدار کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"احسن اللہ خاں مخاطب بہ ظفر خاں ابن خواجہ ابو الحسن ترمذی کہ حاکم کشمیر بود بتوسط محرمان حرم خودش کہ با گسائیں کمال ربط داشتند آشنا شد۔ التماس نمود کہ بر تبتیان فیروزی یابد ترلوچن گفت تسخیر تبت تواں کرد اگر بموجب فرمودہ عمل نمائی ظفر خاں پذیرفت، عہد و پیمان را از جانبین استوار کردند۔ ترلوچن فرمود جمعے از لولیاں، اتعین کن کہ پیوستہ از من جدا نشوند چہ در کیش من بالولی آمیزش ستودہ تر از زنان دیگر است لاجرم ایشاں را دیو کنیاں گویند یعنی دختر فرشتگان۔ و از شراب و مسکرات دیگر بزم خالی نباشند و گوسفند نخست برائے ما کشند حوائج و مصالح اطعمہ آمادہ باشد۔ ظفر خاں بدانچہ گسائیں فرمود عمل نمود۔ چوں بہ تبت لشکر کشید فیروز گشت و مظفر باز آمد۔ انجام میان گوسائیں و ظفر خاں پائے نخش بمیان آمد۔ گوسائیں از دست ظفر خاں بروں رفت۔ مقارن بدیں ظفر خاں بنا بر نزاع سنی و شیعہ کشمیر سبک شد۔ چوں معزولش کردند بہ کابل رفت محمد طاہر نامی از خویشانش در بیت الخلاء چند خنجر جاں فرسا بدو زد۔ مدتہا بداں بیمار بود، ہمدراں زودی منصب و جاگیرش تغیر یافتہ۔ بسا ہنگام در لاہور بے منصب بود۔ نامہ نگار در ہزار و پنجاہ و پنج ترلوچن را در گجرات من اعمال پنجاب دید گفت از رنجش من آں ہمہ آسیب بظفر خاں رسید" (دبستان المذاہب ص ۱۵۱)

مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ اسی ظفر خاں اور محسن فانی کے درمیان ایک طوائف کے بارہ میں بدمزگی پیدا ہو گئی تھی جس نے دونوں جانب سے تلخ نوائی کی شکل اختیار کر لی، وہ طوائف محسن فانی کی منظور نظر تھی، ظفر خاں نے اپنے جاہ و مال کے ذریعہ اس کو اپنی جانب مائل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی

"گویند شیخ را با یکے از لولیہائے کشمیر کہ بچی نام داشت و در غایت رعنائی و نہایت حسن و جمال بود وابستگی تمام بود۔ اتفاقاً ہمدراں ایام ظفر خاں ناظم صوبہ کشمیر نیز با وے تعلق خاطر پیدا کرد و ہر چند او را بنقد و جنس فریب داد خاطرش بجانب خود مائل نیافت۔ آخر غزلے در ہجو بچی و شیخ محسن گفتہ شہرت داد" (مفتاح التواریخ ص ۲۷۵)

لیکن دبستان المذاہب کا مصنف جس گروہ سے تعلق رکھتا تھا، ان کے یہاں اس قسم کی آلودگی ممنوع تھی، صاحب دبستان خواہ آذر ہوشنگی ہو یا نہ ہو صرف اس فرقہ سے متاثر ہی رہا ہو، وہ کم از کم عورت کے معاملے میں اس گروہ کا متبع تھا، لہذا وہ محسن فانی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مصنف دبستان نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کا بقید سنین دبستان المذاہب میں حوالہ دیا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۴۰ھ سے ۱۰۵۲ھ تک کشمیر اور لاہور میں تھا، ۱۰۵۳ھ میں لاہور سے کابل ہوتا ہوا مشہد پہنچتا ہے، ۱۰۵۴ھ میں وہاں سے واپس ہو کر پھر ملتان آیا، اس کے بعد مختلف اضلاع اور دیگر انطاع ہند میں سیر و سیاحت کرتا ہے، لیکن پوری کتاب میں کہیں بھی اس نے الہ آباد میں قیام پذیر ہونے کا ذکر نہیں کیا، البتہ ہندوؤں کی تیرتھ کے سلسلے میں ایک موقع پر الہ آباد کا ذکر ضرور کیا ہے،

"و تیرتھ محل بزرگوار را گویند مثلاً پرایاگ کہ اکنوں مشہور بہ الہ آباد است شہاب لدین پور است۔" (دبستان ص ۱۵۴)

اس لیے اگر اس کا مصنف محسن فانی ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس موقع پر اپنے منصب صدارت کے زمانے میں الہ آباد میں اپنے قیام کا ذکر کیے بغیر گزر جاتے، بالخصوص جب کہ اسی شہر میں اپنے پیر و مرشد شیخ محب اللہ الہ آبادی کے ہاتھوں خرقۂ خلافت زیب تن کیا تھا،

۴۔ محسن فانی کے تذکرے سے جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے، پتہ چلتا ہے کہ بلخ کی تسخیر کے بعد جب محسن فانی منصب صدارت سے معزول کر دیے گئے تو اپنے وطن کشمیر واپس لوٹ گئے، اس کے بعد زندگی کے آخری لمحے تک کشمیر سے باہر قدم نہیں نکالا اور چونکہ بلخ کی تسخیر حسب تصریح عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ ۱۰۵۶ھ میں عمل میں آئی، اس لیے اسی سال محسن فانی کشمیر واپس گئے ہوں گے، لیکن دبستان المذاہب کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف دبستان ۱۰۵۶ھ سے قبل کشمیر ترک کر چکا تھا، ۱۰۵۵ھ میں وہ حیدر آباد اور سورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ۱۰۵۹ھ اور ۱۰۶۳ھ میں وہ صوبہ اڑیسہ کے شہر سریکاکل میں ملتا ہے، اسلیے دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف نہیں ہو سکتی،

غرض خارجی شواہد اور داخلی قرائن کے پیش نظر اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ دبستان المذاہب محسن فانی کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایجابی طور پر ثابت ہے کہ یہ کتاب میرزا ذوالفقار علی الحسینی الاردستانی کی تصنیف ہے، چنانچہ مسٹر ارسکائن (Erskine) نے بمبئی میں ملا فیروز پارسی کے کتب خانہ میں اس کتاب کا جو قلمی نسخہ دیکھا تھا اس میں چودھویں باب کے خاتمہ میں حاشیہ پر ایک عبارت تھی جس میں میرزا ذوالفقار علی الحسینی کا تذکرہ تھا۔ ملا فیروز کی رائے تھی کہ یہی ذوالفقار علی دبستان المذاہب کا مصنف ہے، لیکن فاضل مستشرق اس شہادت سے مطمئن نہیں ہوا، چنانچہ اس نے لکھا:-

On so slight an authority, I would not willingly set up on an unknown author as the cipiler of That work (مقدمہ ترجمہ انگریزی ص ۱۰)

اس معمولی شہادت پر یقین کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں کہ اسکا مؤلف کوئی نامعلوم مصنف ہے۔

ظاہر ہے کہ محض ایک حاشیہ کی عبارت پر اعتماد کر کے ایک مجہول الحال شخص کی جانب کسی کتاب کا انتساب صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے، اس لیے اس نے ملا فیروز کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، اس کے بعد برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر ریو کے سامنے پانچ قلمی نسخے تھے جن میں سے ایک ناقص تھا، دوسرے میں اس کتاب کو شیخ محسن فانی کشمیری کی تصنیف بتایا گیا تھا، تیسرے اور چوتھے نسخوں میں یہ عبارت تھی:-

"دبستان من تصنیف محمد امین نامہ نگار"

لیکن پانچویں نسخے میں اسے میرزا ذوالفقار علی الحسینی المتخلص بہ موبد شاہ کی تصنیف قرار دیا گیا تھا، اسلیے اگرچہ ڈاکٹر ریو نے اس سلسلے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی ہے لیکن ملا فیروز والے نسخے کے حاشیہ کی عبارت پر اعتماد کرتے ہوئے موخر الذکر نام یعنی ذوالفقار علی الحسینی ہی کو ترجیح دی، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

The same name appeared as stated by Erskine, in marginal note of a copy belonging To Mulla Feruz of Bombay. (فہرست فارسی مخطوطات برٹش میوزیم جلد اول ص ۱۴۳)

اس نسخے کے نام کا ذکر ولیم ارسکن نے اپنے حواشی میں کیا ہے، جو بمبئی کے ملا فیروز کا ہے۔

حالانکہ اگر مسٹر ارسکائن اور ڈاکٹر ریو، مستند کتب تواریخ و تراجم کی ورق گردانی کرتے تو انھیں ایسے ماخذ بھی مل جاتے جو ایک حاشیہ (marginal note) سے زیادہ وقیع اور مستند ہیں، مثلاً ماثر الامراء[1] مصنفہ شاہنواز خاں جو اگرچہ مغل دربار کے امراء کی قاموس ہے، پھر بھی اس میں عہد اکبری کے سرکاری الحاد

---

[1] شاہنواز خاں نے اسے ۱۱۵۵ھ میں لکھنا شروع کیا تھا، جیسا کہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"ناگاہ از نیرنگی تقدیر و بو العجبی روزگار در سنہ (۱۱۵۵ھ) یکہزار و یک صد و پنجاہ و پنج عزلتے دازوائے رو داد کہ بظاہر آلستن ہزاران تشویش و خلش توہم می شد لیکن دل ہمین فراوان

(باقی حاشیہ ص ۱۷۶ پر)

(دینِ الٰہی) کی تفصیل اسی دبستان المذاہب کے حوالہ سے مرقوم ہے۔

مآثر الامرا، کوئی معمولی تصنیف نہیں ہے، اس کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ مصنف نے اسکی تالیف کے وقت بہت سے قابل وثوق اور مستند مصادر کو پیش نظر رکھا تھا اور بعض سنی سنائی روایتوں کو نقل کرنے احتیاط برتی تھی، جیسا کہ اس کی تمہید میں لکھا ہے:-

"اگرچہ دریں وقت کتابے موسوم بہ ذخیرۃ الخوانین تصنیف شیخ معروف بھکری متضمن احوال امراء بنظر رسید و اکثر مطالب آں ضمیمۂ ایں نسخہ گردید لیکن چوں بنائے آں بر اخبار سماعی مخالف تحقیق اہل ایں فن بود و ماخذ ایں نسخہ کتب معتبرہ ثقات است رجحانے بدیہی و مزیتے ظاہر بر اں متحقق و ثابت گشت۔" (مآثر الامراء جلد اول ص ۸)

۱۱۷۱ھ میں مصنف کی شہادت کے بعد اس کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور اسی ہنگامہ میں اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کو اس بے نظیر کارنامہ کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس تھا، چنانچہ وہ ایک عرصہ تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہے، بالآخر کامل ایک سال کے بعد اس کے اجزاء دستیاب ہوئے تو انھوں نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کو پھر سے مرتب کیا، چنانچہ خود آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں:-

"بعد یک سال کامل از شہادت مصنف علیہ الرحمہ سررشتۂ تفحص بجائے رسید و دو سہ جزو گم گشتہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۵) آسودگی و آسایش بود، ایں فرصت غیر منتظرہ و فراغ نامترقب را مغتنم پنداشت۔" (مآثر الامراء جلد ۱ ص ۱)

اور ۱۱۷۶ھ سے قبل اس کام سے فارغ ہو گئے تھے، چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:-

"مدت پنج سال اوقات بریں منوال گذرانید۔"

اس شہادت کے بعد ان حضرات کی رائے کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا جن کا دعویٰ ہے کہ مآثر الامراء، دبستان المذاہب کے ایک سو بیس برس بعد لکھی گئی۔

چہرہ پیدائی دانمود، طرفہ شگفتگی بہم رسید و عجب انشراحے دست داد، فی الفور آستین بترتیب و تبییض ایں مسودہ برشکست و اوراق پریشان را شیرازۂ جمعیت بر بست۔" (مآثر الامرا جلد اول ص ۱۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد بلگرامی جیسے محقق کی نظروں میں اس بلند پایہ تصنیف کی کس قدر وقعت تھی، اور انھوں نے کتنی دیدہ ریزی کر کے اس گوہر شب چراغ کو گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچایا۔

خوش قسمتی سے شاہنواز خاں نے دبستان المذاہب کا مصنف میر ذوالفقار علی اردستانی کو بتایا ہے، چنانچہ دین الٰہی کے بارے میں لکھا ہے:-

"و برخے احکام و مسائل ایں مذہب ذوالفقار اردستانی موبد تخلص در دبستان خود (کہ حاوی اکثر اعتقادات فرق ہنود و مجوس و مذاہب مروجہ اہل اسلام است) آوردہ۔" (مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۹۲)

یہاں یہ شک پیدا کیا جا سکتا ہے (جس طرح محسن فانی کے بارے میں کہا گیا کہ اس نام کے ایک سے زیادہ شخص رہے ہوں گے) شاید دبستان المذاہب نام کی ایک سے زیادہ کتابیں رہی ہوں گی، جن میں سے ایک ذوالفقار اردستانی کی رہی ہوگی، جو ممکن ہے محسن فانی کی دبستان المذاہب سے مختلف ہو، مگر یہ شک بے بنیاد ہے، کیونکہ شاہنواز خاں نے اکثر اسی کے حوالہ سے دین الٰہی کے بارے میں بعض واقعات نقل کیے ہیں جو تقابلی مطالعہ کے بعد حرف بحرف موجودہ دبستان المذاہب کی تصریحات کے مطابق ثابت ہوتے ہیں، مثلاً مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۸۱ پر لکھا ہے:-

"در دبستان موبدی مذکور است کہ سلطان خواجہ از الٰہیان بود یعنی بآئینے (کہ بعرش آشیانی نسبت دہند) بہ الٰہی دین موسوم نمایندم گردیدہ بود، ہنگام سفر واپسیں بپادشاہ وصیت نمود کہ مرا بآئین دیگر مردم دفن نفرمایند لاجرم او را در قبر با چراغے در آوردہ شبکہ بمحاذات نیر اعظم

گذاشتند کہ نور او را حق آتم است۔"

یہی مضمون موجودہ دبستان المذاہب (مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۲ھ) میں صفحہ ۲۶۷ پر مذکور ہے:-

"چوں سلطان خواجہ کہ از الہیان بود در وقت تن گذاشتن گفت مرا حضرت آئین دیو مردم دفن نفرمایند لاجرم اورا در قبر با چراغ خاص وشبکہ مقابل حضرت نیر اکبر گذاشتند کہ فروغ او پاک کنندہ گناہان است۔"

نیز مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۸۹ پر مرقوم ہے:-

"در دبستان گفتہ کہ از مرزا شاہ محمد مخاطب بہ عزیز خاں پسر شاہ بیگ خاں خان دوراں شنیدم کہ می گفت من از مرزا عزیز کوکہ پرسیدم کہ چہ میگویند در حرف زدن عرش آشیانی جواب داد کہ والدہ می گفت حق است۔"

اور یہی موجودہ دبستان المذاہب صفحہ ۲۵۴ پر مذکور ہے:-

"از مرزا شاہ محمد مخاطب بہ عزیز خاں خلف شاہ بیگ خان دوراں خطاب ارغون نژاد در ہزار و پنجاہ و سہ در لاہور نامہ نگار شنید کہ گفت کہ از نواب عزیز کوکہ کہ مخاطب بہ خان اعظم پرسیدم کہ چہ می فرمایند در حرف زدن حضرت عرش آشیانی مسیح وار با والدہ ماجدہ جواب داد کہ والدہ می گفت حق است۔"

اسی طرح مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۳۹۰ پر لکھا ہے:-

"در دبستان آوردہ کہ در سنہ (سنہ) ہزار الہیان بعرش آشیانی گفتند کہ ہزار سال ہجری تمام شدہ۔"

اور موجودہ دبستان المذاہب میں صفحہ ۲۶۷ پر مرقوم ہے:-

"گفتند ہزار سال کہ آغاز آں از آں بعثت و مدت بقاے ایں دین بود تمام شد۔"

مآثر الامراء کا مطبوعہ ایڈیشن جن نسخوں کی مدد سے مرتب ہوا تھا ان میں سے ایک نسخہ میں بجائے

ذوالفقار اردستانی کے "ذوالفقار آذر ساسانی" لکھا تھا، مگر اس کے مرتبین مولوی عبدالرحیم و مولوی مرزا اشرف علی سابق مدرسین مدرسہ عالیہ کلکتہ جن کی تصحیح سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، انھوں نے ذوالفقار اردستانی والے نسخہ ہی کو ترجیح دی، اس لیے کہ آذر ساسانی یا خاندانی نسبت ہو سکتی ہے یا مذہبی۔ پہلا احتمال ساقط ہے، اس لیے کہ لائبریری کے کتب خانے میں دبستان کا جو نسخہ ملا تھا اس کے حاشیہ پر صرف مرزا ذوالفقار علی الحسینی لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف دبستان سادات حسینی میں سے تھا، اسکے بعد اس کے ایرانی النسل اور آذر ساسانی ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اور دوسرا احتمال بھی ساقط ہے، اس لیے کہ اولاً مجوسیوں کے فرق پانزدگانہ میں سے کوئی فرقہ آذر ساسانی نہیں تھا، ثانیاً مصنف دبستان آذر کیوان اور اس کے مریدوں سے متاثر اور ان کا معتقد تھا، لہذا زیادہ سے زیادہ آذر کیوانی یا بصحیح اصطلاح میں آذر ہوشنگی ہو سکتا ہے، آذر ساسانی نہیں

غرض نسلی و خاندانی طور پر وہ سادات حسینی میں سے تھا جس کے آبا و اجداد اردستان ایران سے آکر پٹنہ میں آباد ہو گئے تھے، اور وہیں پارسیوں کے حلقہ عقیدت میں اس کی ابتدائی تربیت ہوئی اور جب اس کے اعزا و اقارب اور یہ پارسی جماعت پٹنہ سے اکبر آباد منتقل ہوئی تو ان کے ساتھ مصنف دبستان (میر ذوالفقار علی اردستانی) بھی پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہوا، ۱۰۳۳ھ میں یہ لوگ بنارس پہنچے جہاں موبد ہوشیار جو میر ذوالفقار علی کی تربیت میں خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا، اسے گود میں لیکر چترو نام ایک برہمن مرتاض کے پاس لے گیا جس نے اسے دعائے خیر دی، اور اپنے ایک شاگرد گنیش من کو اس کی ہندوانہ تعلیم و تربیت پر مامور کیا،

بہرحال مرزا ذوالفقار علی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پارسیوں بالخصوص آذر کیوانیوں کے درمیان ہوئی، اس کے بعد اس نے ہندوانہ ماحول میں تعلیم پائی، چنانچہ خود لکھتا ہے:-

"چوں روزگار ناپائیدار نامہ نگار را از پارسیاں جدا افگند ہم انجمن سمنان صنم و

بت قبلہ گان پرستندہ وشن ساخت لاجرم عقائد ایں تدقیق آمود کردہ بعد از پارسیان

گذاردہ می آید" (دبستان ص ۱۰۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا ذوالفقار علی کو پارسی مذہب اور ہندو مذہب کے متعلق بڑی گہری معلومات تھیں، اور چونکہ اس نے آذر کیوانی حلقہ میں تربیت پائی تھی، اس لیے تعصب و تحزب کی وہ شدت جو اہل مذاہب میں ہوتی ہے اسے چھو بھی نہیں گئی تھی، اور چونکہ اس کا مربی موبد ہوشیار آذر کیوانی مسلک رکھتا تھا، اس لیے اس کو اس مسلک کے ساتھ بڑی عقیدت تھی، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آبائی مذہب اسلام کو چھوڑا نہیں تھا،

میرے اس خیال کی تین وجہیں ہیں :-

اولاً یہ کہ آذر کیوانی حلقہ میں تبدیلی مذہب کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ انکے حلقہ میں پارسیوں کے علاوہ ہندو مسلمان اور عیسائی و یہودی سبھی تھے، چنانچہ مصنف دبستان نے اس مسلک کے مذہبی تعصب کے بارے میں لکھا ہے :-

"پس جمعے کہ در مذاہب غیریۂ دانیاں یعنی غیر آبادیاں بودہ اند نزد شاگردان کیوان سلوک کردہ کامیاب شناسائی آمدہ اند برشمردہ می آیند، ہر چند ایں گروہ بیش از اند کہ تواں نگاشت ولے تنے چند سترگ باز نمودہ شوند" (دبستان ص ۳۹)

ان میں سے محمد علی شیرازی (جو میر فتح اللہ شیرازی کا ہمدرس رہا تھا) محمد سعید اصفہانی (جو ذوالفقار علی مصنف دبستان کی طرح سادات حسینی میں سے تھا) عاشور بیگ قرا ملو اور محمود بیگ تین مسلمان ہیں، موسیٰ و ہارون یہودیوں میں (جن کے بارے میں لکھا ہے "بدانشمندی کیش خود اختصاص داشتند") انتون بشوع و دارج عیسائیوں میں (جن کے متعلق لکھا ہے "درکیش نصاری می پوئید") اور بنارس کے دانشمند برہمنوں میں سے رام بھٹ اور اسی طرح رام چند رکھتری ہندوؤں میں سے اس گروہ

کے مرید و عقیدتمند تھے، اس لیے خود مصنف دبستان کے لیے آذر کیوانی حلقہ سے عقیدت استوار کرنے میں اس کا مذہب مانع نہیں ہو سکتا تھا،

ثانیاً، جس انداز میں اس نے حمد و نعوت بالخصوص نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے، اس سے اس کے مسلمان ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا، اور اسے کسی طرح بھی اس بات پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دیباچہ روش عام کے مطابق لکھا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی طور پر "درود نامحدود" بھیج کر گزر جاتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، جن اجرام فلکی کو وہ بار بار مختلف فرقوں کے ذکر میں مختلف مذاہب کے پیروؤں کا معبود بتاتا ہے اور جن کی پرستش کو وہ مختلف اقوام کی سعادت و نیک بختی کی دلیل نقل کرتا ہے، ان ہی ثوابت و سیاروں کو وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم اور مرؤس بتاتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے :-

"درود نامحدود بر والا موجود خورشید سوار سپہر شہود کیوان بندہ، بہرام چشکار بر جیس اختر ناہید پرستار او رنگ پیرائے کشورستان دین و دیہیم خدائے دارالملک یقین" (دبستان ص ۲)

یہ عبارت ایک عقیدتمند مسلمان ہی کے قلم سے نکل سکتی ہے، کسی ایسے پارسی کے قلم سے نہیں نکل سکتی جس کا عقیدہ ہے کہ اجرام فلکیہ انسان سے افضل اور اس کے واجب التعظیم مخدوم ہیں، مثلاً ستارہ زحل کے بارے میں ان کا خیال تھا :-

"شہنشاہ و بزرگان و پرستاران و سائر یزدانیاں چوں بہ کیوان کدہ می رفتند با جامہائے سیاہ و کبود سخن بر تواضع می کردند و بہ آہستگی سر و پیش افگندہ" (دبستان ص ۱۳)

لیکن یہی کیوان پیغمبر اسلامؐ کا غلام ہے جیسا کہ "کیوان بندہ" ترکیب سے ظاہر ہے۔

ثالثاً، مصنف دبستان اپنی سیر و سیاحت کے دوران مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا تھا، جیسا کہ وہ عقیدۂ صادقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"محمد قلی نام مردے بود در مشہد مقدس در ہزار و پنجاہ و سہ با نامہ نگار آشنا شد وبعد از اتحاد گفت بر مسلم داجبست کہ مسیلمہ را مخبر صادق و پیغمبر دانند وگرنہ اسلام او مسلم نیست۔" (دبستان ص ۲۴۱)

بلاد ایران میں سے صرف مشہد مقدس کی تخصیص سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلمان تھا، کیونکہ اگر وہ مجوسی ہوتا تو اسے یزد جانا چاہیے تھا، یا پھر شیراز جو اس کے سرپرست موبد ہوشیار کے پیر و مرشد آذر کیوان کا مولد و منشا تھا۔

ادبی کتابوں کا سٹ

شعر العجم	اول	ہعہ؍	شعر الہند	اول	ہعہ؍
"	دوم	ہے؍	"	دوم	معہ
"	سوم	ے؍	گل رعنا		ہے؍
"	چہارم	ہے؍	انتخابات شبلی		ے؍
"	پنجم	ہے؍	اقبال کامل		ے؍
کلیات شبلی	اردو	ع	بزم تیموریہ		معہ؍
مکاتیب شبلی	اول	ع؍	بزم مملوکیہ		صہ؍
"	دوم	للعہ			

پورے سٹ کے خریدار کو ۱۵ فی صدی کمیشن

۱۰۰ سے ۵۰۰ روپے تک ۲۰ " "

۵۰۰ سے ۱۰۰۰ تک ۲۵ " "

۱۰۰۰ سے اوپر تک ۳۰ " "

"منیجر"

کیا حسابِ تقویم کی رو سے سنہ ہجری کے دن اور تاریخ کا تعین ہو سکتا ہے؟

از جناب مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی

(۲)

اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ باطنیہ فرقہ نے جو تشیع اہل بیت کا مدعی ہے، البیرونی نے قاعدۂ مذکور کو عمل میں لا کر ایک حساب پیش کیا ہے، جس کے بارے میں اس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ وہ اسرار نبوت میں سے ہے، حالانکہ یہ سارا حساب اسی قاعدہ پر مبنی ہے، صاف صاف اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ رویت ہلال کے بارے میں اثبات یا نفی میں کوئی قطعی اور حتمی حکم لگانا اہلِ فن کی استطاعت سے خارج ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

ووجدت بعض رؤسائھم	اور میں نے اس جماعت کے ایک سربر آوردہ
اخذ الجدول المجرد الذی	شخص کو دیکھا کہ اس نے مجرد اس گوشوارے کو
وضعہ حبش فی زیجہ لتصحیح	لیکر جو حبش نے اپنی زیچ میں اس غرض سے
التاریخ المستعمل فی حساب	مرتب کیا تھا کہ کواکب کے حساب میں جو تاریخ
الکواکب............	مستعمل ہوتی ہے اسکی تصحیح کیجائے........
واقتفی اثرالقوم بوضع کتاب	اپنی قوم کے قدم بقدم چلتے ہوئے ایک کتاب
طعن فیہ علی طالبی الہلال	تصنیف کی جس میں رویت ہلال کے تلاش

بالرویة وسبهم وغیرهم باستثناء
الیهود والنصاری عن طلب الهلال
للصیام واوائل الشهور بما عندهم
من الجداول واشتغال المسلمین
بالمتشابه من الاحوال، ولو جاوز
موضع الجداول المجرد من زیج
حبش حتی انتهی الی اعمال اصحاب
الهیئة فی رویة الهلال ووقف
علی کیفیاتها علی حقائق ما علیه
الیهود والنصاری لعلم ان الذی
ذهب الیه اهل الکتاب هی الشبه
بعینها وعسی الواقف علی ما قدمنا
یحقق ذلک

کرنے والوں پر طعن وتشنیع کی، ان کو برا بھلا کہا
اور عار دلائی کہ یہود ونصاری کو تو اپنے
روزوں کے لیے اور مہینوں کی پہلی تاریخ
معلوم کرنے کے لیے رویت ہلال کی ضرورت
نہیں پڑتی کیونکہ ان کے پاس اسکے گوشوارے
موجود ہیں، اور اہل اسلام مشتبہ حالات
میں پڑے ہوئے ہیں، لیکن اگر یہ شخص حبش کی
زیج میں اس مجرد جدول کے مقام سے آگے
بڑھ کر ذرا اس مقام تک آتا کہ جہاں رویت
ہلال کے بارے میں اصحاب ہیئت کے اعمال
کا ذکر ہے اور ان اعمال کی کیفیات پر
اور ان حقائق پر مطلع ہوتا جن پر یہود ونصاری
کا عمل ہے تو اسے پتہ چلتا کہ یہود ونصاری
جس طرف گئے ہیں مشتبہ در اصل وہی ہے، اور
امید ہے کہ جو شخص سابق میں ہماری بیان کردہ
تفصیلات سے واقف ہوگا وہ ہماری اس بات
کی تصدیق کرے گا۔

علی ان علماء الهیئة مجمعون
ان المقادیر المفروضة فی اواخر

اس کے علاوہ علمائے ہیئت اس بات پر متفق
ہیں کہ جو مقداریں اعمال رویت ہلال کے

اعمال رویة الهلال هی ابعاد لم
یوقف علیها الا بالتجربة والنظر
احوال هندسیة یتفاوت لاجلها
المحسوس بالبصر فی العظم
والصغر، وفی الاحوال الفلکیة
ما اذا تاملها متامل منصف
لم یستطع بت الحکم علی وجوب
رویة الهلال او امتناعها
وخاصة حین یقع قریبا من نهایة
ذلک البعد المفروض

(ص ۱۹۷ - ۱۹۸)

اواخر میں فرض کی گئی ہیں وہ ایسے ابعاد ہیں
جن پر صرف تجربے سے واقفیت حاصل کی گئی ہے،
حالانکہ دیکھنے میں علم ہندسہ کے اعتبار سے
ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن کی بنا پر
جو چیز آنکھوں سے محسوس ہوتی ہے اس میں
بڑائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے فرق ہوتا رہتا
ہے، نیز فلکی حالات میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے
جس کی بنا پر اگر کوئی غور کرنے والا منصف مزاج
غور وتامل سے کام لے تو رویت ہلال کے
بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی حتمی حکم نہیں
لگا سکتا، خاص طور پر جبکہ چاند اس بعد مفروض
کی انتہا کے قریب ہو۔

ملاحظہ فرمائیے، یہ ہے بیرونی کی تصریح کہ "کوئی صاحب فن جو انصاف سے بہرہ ور ہو اور غور وتامل سے پوری طرح کام لیتا ہو، وہ ہرگز یہ نہیں کر سکتا کہ رویت ہلال کے متعلق نفی یا اثبات میں کوئی قطعی یا حتمی حکم لگا دے"، بیرونی نے یہ دعوی علم وفضل کی روشنی میں کیا ہے، جن کے وجوہ و دلائل کی تفصیل ابھی آپ کی نظر سے گذر چکی ہے، آج ریاضی کا فن بڑی ترقی کر گیا ہے، تاہم ابھی تک بیرونی کے اس دعوے کی علمی تردید نہیں کی جاسکی، چنانچہ ابتک رویت ہلال کی کوئی ایسی صحیح تقویم دنیا کے سامنے مرتب ہو کر نہیں آئی کہ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو،

ہمارا محکمۂ موسمیات جس طرح آئے دن یہاں کے موسم اور باد و باراں کے متعلق پہلے سے اعلان

اعلان کرتا رہتا ہے، اسی طرح رویت ہلال کے بارے میں بھی اس کی پیشین گوئیاں برابر صادر ہوتی رہتی ہیں، لیکن وہ جس محتاط انداز میں اعلان کرتا ہے وہ خود جزم و یقین کی نفی کے لیے کافی ہے، مثلاً ۱۳۸۰ھ میں عید اور بقرعید کے چاند کے متعلق ہمارے محکمۂ موسمیات نے جو پیشین گوئی کی تھی، وہ ناظرین کی معلومات کے لیے روزنامۂ جنگ کراچی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:-

عید کا چاند ۱۷ مارچ کو نظر آئیگا

"کراچی ۱۴ مارچ (اسٹاف رپورٹر) پاکستان کے محکمۂ موسمیات نے اعلان کیا ہے کہ پورے ملک میں خاص کر مغربی پاکستان میں چاند ۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء کو نظر آنے کے قوی امکانات ہیں۔" (روزنامۂ جنگ کراچی، ۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء ص ۲ کالم ۱)

ذی الحجہ کا ہلال ۱۵ یا ۱۶ مئی کو نظر آئیگا

"کراچی ۱۰ مئی (اسٹاف رپورٹر) ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ میں کہا گیا ہے کہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ کا ہلال ۱۶ مئی کو نظر آئیگا، تاہم ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء کو بھی اس کے نظر آنے کا کچھ امکان ہے جبکہ ڈھاکہ کم (۹ بجکر ۵ منٹ مشرقی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) اور راولپنڈی (۲ بجکر ۲۰ منٹ مغربی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) میں مغرب کے وقت یہ علی الترتیب ۱۲ منٹ، ۱۵ منٹ اور ۱۰ منٹ افق سے اوپر رہے گا"

لہ ان پیشین گوئیوں کی صحت و عدم صحت کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، پورا ملک اس سے واقف ہے، بلکہ ساری دنیا کا عالمی ریکارڈ آپ کو بتا دے گا کہ ہر جگہ کے محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئیوں کا اوسط فی صد کیا رہتا ہے۔ آپ خود بھی زحمت فرمائیں تو ہر سال محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئیوں کا جائزہ لیکر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی صحت کا اوسط فی صد کیا رہتا ہے۔

"۱۵ مئی کو یہ ہلال اس صورت میں نظر آسکتا ہے جب مغرب کے وقت افق کے قریب سورج غروب ہونے کے مقام سے بائیں جانب تقریباً ۵ ڈگری پر دیکھنے کے حالات بہت اچھے ہیں۔" (روزنامہ جنگ کراچی مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۶۱ء ص ۶ کالم ۱)

ظاہر ہے موجودہ دور میں اگر علم و فن کی روشنی میں رویت ہلال کے بارے میں آسانی کوئی صحیح فیصلہ حتمی اور قطعی صورت میں کیا جا سکتا تھا تو ہمارا "محکمۂ موسمیات" ہلال ذی الحجہ کے متعلق یہ مذبذب بات کیوں کرتا اور ہلال عید کی پیشین گوئی کرتے وقت "قوی امکانات" کے الفاظ کیوں استعمال کرتا، جو جزم و یقین کے منافی ہیں، معلوم ہوا بات وہی ہے جو بیرونی کہتا ہے کہ "جو شخص منصف مزاج ہو اور غور و تامل سے کام لے وہ کبھی رویت ہلال کے بارے میں قطعی اور حتمی حکم نہیں لگائے گا۔" چنانچہ ہلال عید کے بارے میں رویت کے "قوی امکانات" کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ روزنامہ انجام کراچی کا اسٹاف رپورٹر ۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء کے کوائف بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"محکمۂ موسمیات نے آج بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کل شام عید کا چاند نظر آگیا تھا اس لیے آج عید تھی، محکمہ کے بیان کے مطابق عید کا چاند دیکھنے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں میں رصدگاہیں قائم کی گئی تھیں، ہاؤسنگ سوسائٹی کی رصدگاہ سے اطلاع ملی تھی کہ وہاں دوربینوں سے چاند نظر آگیا ہے۔" (روزنامہ انجام کراچی، عید اڈیشن ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء ص ۷، کالم ۲)

یہ ہے "قوی امکانات" کے بارے میں خود محکمۂ موسمیات کی شہادت کہ شہر کے مختلف علاقوں کی رصدگاہوں میں صرف ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی رصدگاہ سے چاند نظر آیا اور وہ بھی دوربین کی مدد سے، حالانکہ حکم شرعی سے قطع نظر خود علم ہیئت میں بھی آغاز ماہ قمری کے لیے رویت ہلال میں طبعی رویت کا اعتبار ہے، نہ رویت ارادی کا، یعنی اس رویت کا اعتبار ہے جو قدرتی طور پر آنکھوں سے محسوس ہو نہ کہ اس رویت کا جو غیر طبعی طور پر آلات رصدیہ کی مدد سے حاصل ہو، چنانچہ زیچ بہادر خانی کے "باب ہفتم

"در رویت ہلال" میں مرقوم ہے:-

مراد از رویت طبعی است نہ ارادی کہ بتوسط منظارہائے جدیدہ بہ بینند چہ دریں حالت ہلال قبل از آنکہ بحد رویت رسیدہ باشد دیدہ می شود

(ص ۵۵ طبع بنارس ۱۸۵۸ء)

رویت ہلال سے مراد طبعی رویت ہے نہ کہ رویت ارادہ کہ اعلیٰ قسم کی دوربینوں کے ذریعہ ہلال کو دیکھا جائے کیونکہ اس حالت میں تو ہلال کو اس کے حد رویت پر پہنچنے سے قبل بھی دیکھا جا سکتا ہے،

عجیب بات ہے کہ ہمارے محکمۂ موسمیات کو اس مرتبہ نہ جانے کیوں اس غیر طبعی رویت کی صحت پر بڑا اصرار رہا، حالانکہ پیشین گوئی کے الفاظ میں جزم و یقین کا شائبہ تک نہ تھا، علما اور عوام تو ظاہر ہے کہ محکمۂ موسمیات کے اس اعلان کو کس طرح صحیح تسلیم کر سکتے تھے جبکہ مطلع صاف ہونے کے باوجود رویت عامہ نہیں ہوئی اور جم غفیر کو چاند نظر نہیں آیا، لطف یہ ہے کہ خود ارباب فن نے بھی محکمہ کے اس بیان کو صحیح باور نہیں کیا، چنانچہ روزنامہ انجام کراچی کی حسب ذیل خبر ملاحظہ ہو:-

عید کے چاند کے متعلق محکمۂ موسمیات کو پنجاب یونیورسٹی کی رصدگاہ کا چیلنج

"لاہور ۲۰ مارچ (پ پ) پنجاب یونیورسٹی کی رصدگاہ نے آج "محکمۂ موسمیات کے ڈائرکٹر کے اس دعوے کو چیلنج کیا ہے کہ چاند اگر اعشاریہ ۷ یا اعشاریہ ۸ دن کا ہو تو مطلع کی عام حالت میں اسے آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے، ایک انٹرویو میں رصدگاہ کے حکام نے بتایا ہے کہ جمعہ کی شام کو محض آنکھ سے چاند کا دیکھنا بہت مشکل تھا، کہا جاتا ہے کہ جمعہ کی شام کو کراچی میں ۸۰ منٹ تک چاند دیکھا گیا، لیکن یہ بیان بھی بالکل غلط ہے اس لیے کہ نیا چاند کبھی بھی اتنی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، نہ ہی اتنا روشن ہو سکتا ہے کہ اسے انسانی آنکھ دیکھ سکے۔" (روزنامہ انجام کراچی مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء ص ۱ کالم ۵)

یہ ہے اہل ہیئت و اصحاب نجوم کی اس درماندگی کی روداد جو انھیں قمر کی صرف ایک حالت یعنی رویت ہلال کے انضباط میں پیش آتی ہے[1]، اور ظاہر ہے کہ جب رویت ہلال کا صحیح انضباط

---

[1] یہ واضح رہے کہ ہماری بحث اس سلسلہ میں جو کچھ ہے وہ خالص فنی نقطہ نگاہ سے ہے، یعنی اب تک علم ہیئت و ریاضی میں اتنی ترقی نہیں ہو سکی ہے کہ رویت ہلال کی کوئی صحیح تقویم بن سکے، اس لیے کسی خود ساختہ فرضی اصطلاحی تقویم کی بنا پر مورخین اسلام کے بیان کردہ دنوں کی صحت سے انکار کرنا بہت بڑی جسارت ہے، رہا شرعی حیثیت سے آغاز ماہ و سال کا مسئلہ تو شریعت مطہرہ نے ثبوت ہلال کا دارومدار رویت پر رکھا ہے یا شہادت پر لیکن منجمین و موقتین کے حساب و کتاب کا اس بارے میں اعتبار ہی نہیں کیا ہے، اس لیے علمی اصطلاح میں ہم اس کو "الغا" کہیں گے نہ کہ ابطال، الغا اور ابطال میں بڑا فرق ہے "الغا" کے معنی ہیں کسی چیز کے کالعدم قرار دینے کو، اور "ابطال" کے معنی ہیں اس کی تکذیب کرنا اور اس کو غلط بتانا، اس لیے خوب سمجھ لیجیے کہ شرع نے ہلال کے باب میں اہل ہیئت کے فیصلہ کا الغا کیا ہے، یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے ان کے کسی اعلان سے شرعاً مہینہ کے ثبوت یا عدم ثبوت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، لیکن ان کے حساب و کتاب کا ابطال نہیں کیا ہے، یعنی نہ اس کی تکذیب کی ہے، اور نہ اس کو غلط بتایا ہے، اس لیے اگر بالفرض کل علم ہیئت اتنی ترقی کر جائے کہ رویت ہلال کی صحیح تقویم بن جائے اور جو پیشین گوئی بھی اس بارے میں کی جائے وہ حرف بحرف صحیح نکلے تب بھی اس حکم شرعی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ شریعت کا موضوع ریاضی یا ہیئت کے کسی نظریہ کی تصدیق یا تکذیب نہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ متعدد امور کا شریعت نے الغا کیا ہے، لیکن ان کا ابطال نہیں کیا ہے، مثلاً اندھیری رات میں جبکہ سمت قبلہ مشتبہ ہو ایک شخص بغیر تحری کیے اور اپنی اٹکل کو کام میں لائے جانب قبلہ نماز ادا کرتا ہے تو شرعاً اس کی یہ نماز (اگرچہ وہ واقعہ میں جانب قبلہ ہی ادا کی گئی ہے) کالعدم ہے، کیونکہ شریعت نے ایسے موقع پر یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیکر پہلے قبلہ کا رخ متعین کر لے اور جس طرف اس کا

ان کے بس میں نہیں تو پھر وہ اپنی تقویم کا حساب رویت ہلال پر کس طرح رکھ سکتے تھے، ناچار ان کو حقیقی قمری ماہ و سال کی بجائے تقویم کا حساب اپنے فرض کردہ اصطلاحی قمری ماہ و سال سے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۹) دل گواہی دے کہ ادھر قبلہ ہے اسی سمت نماز ادا کرلے اور اس صورت میں اگر سمت قبلہ کی تعیین میں اس سے خطا بھی ہو تب بھی اس کی نماز صحیح ہے، لیکن بغیر سوچے سمجھے اگر قبلہ کی بالکل صحیح سمت میں بھی اس نے نماز ادا کی تو وہ ناقابل اعتبار ہے، اسی طرح سب جانتے ہیں کہ خود خلیفہ یا قاضی اگر کسی شخص کو اپنے سامنے زنا یا چوری یا کسی جرم کا ارتکاب کرتے دیکھے تو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر (جب تک اس شخص کے خلاف ثبوت جرم کی پوری شہادت فراہم نہ ہو) اس پر حد جاری نہیں کرسکتا، لیکن صرف شہادت کے پیش ہونے کی صورت میں (گو امیر یا قاضی کو ارتکاب جرم کا سرے سے کچھ علم نہ ہو) حد کا جاری کرنا اس پر فرض ہے، حالانکہ اکثر حالات میں مشاہدہ سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے اور شہادت سے علم ظنی، ان دونوں مثالوں سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ "الغاء" و "ابطال" میں کتنا بین فرق ہے، پہلی صورت میں شریعت نے قبلہ کی صحیح سمت میں جو نماز بغیر تحری ادا کی جائے اس کا الغاء کیا ہے، یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے، مگر قبلہ کی طرف بڑھنے کا ابطال نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ اس نے جانب قبلہ نماز ادا نہیں کی، اسی طرح دوسری صورت میں قاضی یا امیر کے مشاہدہ کا ابطال نہیں کیا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا غلط دیکھا، بلکہ اس کا الغاء کیا ہے کہ یہ مشاہدہ اجرائے حدود کے باب میں کالعدم ہے۔

ہماری اس تقریر سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو مصر کے مشہور صحافی سید رشید رضا کو رویت ہلال کے مسئلہ میں پیش آیا ہے، ان کے شبہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ شہادت سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہے اور حساب سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے، اس لیے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں جب شہادت پر اعتبار کرلیا جاتا ہے تو پھر تقویم پر کیوں نہیں کیا جاسکتا، جبکہ تقویم کی بنیاد

کرنا پڑا جس کی بنا پر ان کی تقویم کے حساب میں اور ماہ ہلال حقیقی کے حساب میں ایک دو دن کا فرق ہو جانا روزمرہ کی بات ہے، چنانچہ عصر حاضر کے مشہور موقت سید محمد بن محمد بن عبد اللہ اپنی مشہور کتاب مجموعۃ الیواقیت العصریۃ میں لکھتے ہیں :-

ثم اعلم ایضاً انہ قد یوافق	پھر تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کبھی مہینہ
اول الشھر بالحساب اولہ	کی پہلی تاریخ جو حساب کی رو سے ہوتی ہے
بالھلال، وقد یتقدم الحساب	وہی ہلال کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے اور
عن الھلال وقد تتوالی اربعۃ	کبھی حساب میں مہینہ ہلال سے پہلے ہی
اشھر ثلاثون ثلاثون یوما	شروع ہو جاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۰) علم ریاضی پر ہے، اس میں اولاً تو یہی دعویٰ غلط ہے کہ ریاضی کے اصول پر ہلال کی کوئی تقویم بن سکتی ہے، اور اگر بالفرض بن بھی جائے تو اس کی بنا پر حکم شریعت میں ترمیم نہیں کیجا سکتی، جبکہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نے سرے سے موقتین کے حساب وکتاب کو کالعدم قرار دیدیا ہے، ہم نے یہاں وہ مثال بھی پیش کردی ہے جہاں شرع میں علم ظنی کا اعتبار ہے، اور علم قطعی کو کالعدم قرار دیا ہے، غور فرمایئے اگر قاضی یا امیر مملکت کو اپنے ذاتی علم و مشاہدہ کی بنا پر اقامت حدود کا حق دیدیا جاتا تو پھر اسکی کیا ذمہ داری تھی کہ کل کو قاضی صاحب یا امیر مملکت جس سے خفا ہوتے اس کو محض اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر سنگسار نہ کرادیتے، ایک بیچارہ ناکردہ گناہ لاکھ چلاتا اور سر پیٹتا کہ میں بالکل بے قصور ہوں مگر قاضی صاحب یہ کہکر اس کا خاتمہ کردیتے کہ میں نے تو خود تجھے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے، اسی طرح جب شریعت مقدسہ نے عام مسلمانوں کو صیام و افطار کا حق رویت ہلال کی بنا پر دیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بغیر ہلال کو دیکھے یا اس کی رویت کی شہادت گذرے محض اپنے حساب وکتاب کی بنا پر اس حق کو ان سے چھین لے اور اپنے اعلان کے مطابق انھیں صیام و افطار پر مجبور کرے۔

وثلاثة اشهر تسعة وعشرين	ہلال کے لحاظ سے مسلسل چار ماہ تیس تیس
يوماً بالهلال ولا يتوالى اكثر	دن کے اور تین ماہ انتیس انتیس دن کے
من ذالك	ہو جاتے ہیں، مگر یہ تسلسل اس سے زیادہ نہیں رہتا۔
واما بالحساب فانما شهر	لیکن حساب کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ماہ
ثلاثون وشهر تسعة و	تیس کا ہوتا ہے اور دوسرا انتیس کا اور
عشرون لا متغير (ص ۱۹۴ طبع مصر سنہ ۱۳۴۹ھ)	اس میں تبدیلی نہیں ہوتی،

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ تقویم کا حساب اصطلاحی ماہ و سال پر مبنی ہے، اور مسلمانوں کا حساب حقیقی ماہ و سال پر۔ اس لیے ہر دن اور ہر تاریخ میں ان دونوں کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے اختلاف کی صورت میں بجائے اس کے کہ تقویم سے مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچا جائے، علم و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ خود مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں سے تقویم کو درست کر لیا جائے۔ کیونکہ مورخین اسلام نے اپنی تصانیف میں ہر دن کی وہی تاریخ لکھی ہے جو رویت ہلال کے لحاظ سے اس روز ان کے یہاں تھی، اور یہی تاریخ حقیقی تاریخ ہے، اور اسی کا شرع میں بہ نص قرآنی اعتبار ہے۔

اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے

(۳)

۱۰۔ ماوراء النہر سے بھی عجیب تر حالات ایران میں رونما ہو رہے تھے جو ہندوستان میں حکمت و معقولات کے ساتھ اعتناء کے لیے محرک قوی بن گئے،

دسویں صدی کے آغاز میں ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی، یہ ایک قسم کی "قومی ریاست" (National State) تھی۔ اس لیے رجعت پسند احیائی" (Revivalist) تحریکوں کو پھر سے سر اٹھانے کا موقعہ ملا، یہ مذہبی انقلابی تحریکیں تھیں، اور انھوں نے سابق کی اسلام دشمن تحریکوں کی طرح اپنی تنظیم فلسفیانہ بنیادوں پر رکھی تھی، ان میں دو تحریکیں زیادہ اہم تھیں: مسلمانوں میں فرقۂ نقطویہ اور پارسیوں میں فرقۂ آذر کیوانیہ۔

۱۔ نقطوی تحریک کا بانی محمود پسیخوانی تھا، جو شروع میں حروفی فرقے کے بانی فضل اللہ کا متبع تھا مگر بعد میں اس نے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا نام "نقطویت" ہے، کیونکہ بقول صاحب دبستان المذاہب

"شخص واحد نقطہ گوید و خاک را می خواہد و عناصر دیگر بزعم او از خاک موجود اند ......

و خاک را بیرون از عنصر ندانند و واجب و مبدء اول نقطۂ خاک را شمرد"۔

محمود پسیخوانی بھی پچھلے ملاحدہ کی طرح خود کو نہ صرف نبوت کا بلکہ الوہیت کا مظہر سمجھتا تھا، چنانچہ جیسا کہ تصریح دبستان المذاہب کے تبعین کہتے تھے: "چوں جسد کامل شد از ان محمود سر بر زد و بہ نسبت مقلما محمود اخبر آن ست"۔

ان ہفوات و اباطیل سے تو سلاطین کو زیادہ مطلب نہیں تھا، مگر اس کے ادعائے مہدویت سے انھیں خطرہ ہونے لگا کیونکہ "محمود را شخص واحد نامد و مہدی کہ موعود دانند کہ نبی بظہور او خبر داد و گوید کہ دین محمد منسوخ شد اکنوں دین این محمود است"

چونکہ سابق کی ملحدانہ احیائی تحریکوں کی طرح نقطوی تحریک بھی ایران کے قومی مزاج کے لیے بڑی خوشگوار تھی، اس لیے اس کے پیرووں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی، شاہ طہماسپ اور سلطان محمد خدابندہ نے اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی، البتہ شاہ عباس صفوی نے بڑی سختی سے مواخذہ شروع کیا اور ۱۰۰۲ھ میں بیشمار نقطوی قتل کر دیے گئے، ان میں میر سید احمد کاشی بھی تھا، اس کے کاغذات میں جو رسالے ملے ان سے معلوم ہوا کہ:۔

"نقطوی حکما، کے مذہب کے مطابق عالم کو قدیم مانتے ہیں اور حشر اجساد اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے نزدیک اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے نتیجے میں جو دنیوی عافیت یا ذلت ملتی ہے، وہی بہشت و دوزخ ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقطویوں نے بھی اپنی آئیڈیالوجی فلسفہ کی تعلیم پر استوار کی تھی، شاہ عباس کی دار و گیر سے نقطویوں کے لیے ایران میں رہنا ناممکن ہو گیا، اور وہ یا تو تقیہ کرنے پر مجبور ہوئے جیسا کہ صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے،

" و پیروان او در ربع مسکون متفرق اند و در ممالک ایران زمین بسیار اند اما خود را آشکارا نیارند ساخت چه علیین آشنائی شاہ عباس جمعے کثیر از آنہا را کشت"

یا بھاگ کر ہندوستان چلے آئے، جہاں اکبر اس قسم کی بدعات کا دل و جان سے قدر دان تھا، بدایونی کا خیال ہے کہ ایران سے آنے والے شعرا، کی اکثریت الحاد پسند تھی:

"تمامی شعراء عصر کلہم و جلہم صغیر ہم و کبیر ہم مگر سہ چہار نفر از قدمائے معمر جوزقی حیدری مشرب اند"

ان میں غزالی اور قاسم کاہی سر آمد ملاحدہ روزگار تھے، بدایونی آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"اما این ہر دو مقتدا و پیشوائے ہمہ بودند کہ وراثت خباثت را باتباع و اشیاع خویش بقدر مناسبت و استعداد ذاتی و بفیض صحبت گزشتہ تقسیم کردند"

ان ملاحدہ میں محمد شریف آملی، حیاتی کاشی، تشبیہی، عرفی، نازندرانی، عبداللہ کاشی، عبد الغنی یزدی (اللہ مرکبی) پسیخوانی تھے، شریف آملی سے اکبر کو اپنی الحاد پسندی میں بڑی تقویت حاصل ہوئی، کیونکہ اس نے اکبر کو وقت کے "صاحب الزماں" کا مصداق ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی، اور بقول بدایونی ۹۹۰ھ میں دنیا پرست علماء نے اس بات کی تائید میں دلائل تراشنا شروع کیے کہ "جنگ ہفتاد و دو ملت" میں فیصلہ کرنے والا صرف اکبر ہی ہے اور شریف آملی نے محمود پسیخوانی کے رسالوں سے شواہد پیش کیے کہ ۹۹۰ھ میں "صاحب دین حق" کا ظہور یقینی ہے، اور اس کا مصداق صرف اکبر کی ذات ہے،

غرض یہ الحاد پسند شعرا، خواہ پسیخوانی ہوں جیسے شریف آملی وغیرہ یا وارستہ مزاج قید مذہبی سے آزاد جیسے قاسم کاہی وغیرہ علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق بدایونی لکھتا ہے:۔

"از علم تفسیر و ہیئت و کلام، و تصوف و ادراک بہرۂ تمام بود" یا تشبیہی کاشی کے متعلق لکھتا ہے:

"دعوت الحادی می نماید و مردم را بکیش پسیخوانیاں میخواند و شیخ ابو الفضل خود را مجتہد داناند"۔ اس تفلسف پسندی سے شعراء ہندوستان بھی متاثر ہوئے، چنانچہ فیضی کہتا ہے:۔

امروز نے شاعرم حکیم دانندۂ حادث و قدیم

اس کا اثر معاشرہ کے ذوق و مزاج پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لیے فطری طور پر اس ملک کے علمی حلقوں میں فلسفہ و حکمت سے اعتنا، بڑھنے لگا،

ب۔ دوسری تحریک پارسیوں میں آذر کیوانیوں کی تھی، اس کا بانی آذر کیوان ایران قدیم کے ایک عجیب الطرفین خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ایرانیوں کا خیال تھا کہ ان کے یہاں قدیم زمانہ سے فلسفہ و حکمت کا چرچا رہا ہے، اس لیے جب کبھی ایران میں کوئی احیائی تحریک اٹھی تو اس نے اس مزعومہ "ایرانی حکمت" (حکمت مشارقہ) کے احیا، کی بھی کوشش کی، کیونکہ یونانی فلسفہ کی کورانہ تقلید

ذہنی غلامی کے مترادف تھی، چنانچہ تیسری صدی میں ابوبکر بن زکریا الرازی نے حسب تصریح امام رازی و میر سید شریف "حرنانیت" کو دوبارہ زندہ کیا جو قدیم ایرانی "زرادتیت" کی ایک شکل تھی، پانچویں صدی کے آغاز میں شیخ بوعلی سینا نے اس مزعومہ ایرانی حکمت کو "الحکمۃ المشرقیہ" کے نام سے مدون کیا، مگر بدقسمتی سے ۵۴۲ھ میں یہ کتاب غائب ہوگئی، چھٹی صدی کے آخر میں شہاب الدین سہروردی مقتول نے بزعم خود ایران قدیم کے اس فلسفی ورثہ کو "حکمۃ الاشراق" میں مدون کیا، چنانچہ علامہ قطب الدین شیرازی نے "شرح حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

حکمۃ الاشراق ای حکمۃ	حکمت الاشراق یعنی ایسی حکمت جس کی بنیاد
الموسسۃ علی الاشراق الذی	اشراق پر رکھی گئی، اشراق کے معنی کشف یا
ھی الکشف او حکمۃ المشارقۃ	حکمت مشارقہ کے ہیں، یہ لوگ اہل فارس
الذین ھم اھل فارس وھو ایضاً	ہیں سے تھے، اس لیے اس حکمت کا مرجع
یرجع الی الاول لان حکمتھم	بھی اول حکمت کی جانب ہے، کیونکہ انکی
کشفیۃ ...... وکان اعتماد	حکمت کشفی ہے، اور حکمت میں
الفارسیین فی الحکمۃ علی	فارسیوں کا اعتماد ذوق اور کشف
الذوق والکشف	پر تھا۔ [1]

خود سہروردی اس طریق اشراق کو حکمائے ایران کی خصوصیت بتاتا تھا، چنانچہ "حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھتا ہے:۔

وعلی ھذا ابتنی قاعدۃ الاشراق	اور اسی پر نور و ظلمت کا اشراق کا قاعدہ
فی النور والظلمۃ التی کانت طریقۃ	مبنی ہے، جو فارس کے حکماء جاماسب، فرشاد
حکماء الفارس مثل جاماسف و	سوربزرجمہر اور ان کے پیشرووں کا

وفرشاد شور وبوزرجمھر	طریقہ تھا،
ومن قبلھم	

بعد میں بھی اس مزعومہ ایرانی حکمت کے ساتھ ایرانیت پسندوں کا اعتنا برقرار رہا، مگر پھر سہروردی جیسا کوئی عبقری پیدا نہیں ہوا، متاخرین نے صرف اس کے شرح و تحشیہ ہی پر اکتفا کیا، ان میں سب سے اہم قطب الدین شیرازی کی "شرح حکمۃ الاشراق" تھی، نویں صدی میں محقق دوانی اکثر شرح حکمۃ الاشراق کا درس دیا کرتے تھے، انھوں نے سہروردی کی "ہیاکل النور" کی شرح بھی لکھی تھی، بعد میں شرح حکمۃ الاشراق پر جو حواشی لکھے گئے ان میں سب سے اہم ملا صدرا کا حاشیہ تھا،

بہرحال اس "حکمت اشراق" کی بنیاد کشف و ذوق پر تھی، جو نتیجہ ہوتا تھا مجاہدہ و ریاضت کا، اور اس کا ثمرہ بتایا جاتا تھا کہ انسان حسب خواہش بدن عنصری چھوڑنے پر قادر ہو جاتا ہے، چنانچہ خود سہروردی نے اپنے مزعوم امام حکیم افلاطون الٰہی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"وذوات الاصنام من الانوار القاھرۃ شاھدھا المجردون بانسلاخھم عن ھیاکلھم مرارًا کثیرۃ ..... وحکی افلاطون عن نفسہ انہ خلع الظلمات وشاھدھا"

اور یہی وطیرہ آذر کیوان نے اختیار کیا، صاحب دبستان المذاہب نے اس کے ریاضت و مجاہدہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

"آذر کیوان بازلی تائید یزدانی نیرو از پنجسالگی بکم خوری و شب بیداری پرداخت ..... بست و ہشت سال در خم نشست، ہشتاد و پنجسال با عنصری پیکر بود، و دست از ریاضت باز نداشت"

اس کے کشف و کرامات کے بارے میں مشہور تھا کہ جب اس نے حکمائے یونان و ایران

کی تعلیمات پر مطلع ہونا چاہا تو انھوں نے خود خواب میں آکر اپنا سارا علمی سرمایہ اس کے سپرد کر دیا، اس لیے اس کا نام ذوالعلوم پڑ گیا، "انخلاع جسد عنصری" کی کرامت کے بارے میں اس کے شاگرد فرزانہ بہرام نے لکھا ہے:-

"کیوان می فرمود پیوند روان من با جسم تن چوں نسبت بدن بہ پیراہن است کہ ہر گاہ میخواہم ازو می گسلم و چوں می خواہم بدو می پیوندم۔"

اسی طرح اس کے متبعین کے بارے میں ناقابل قیاس کشف و کرامات کی داستانیں مشہور تھیں، صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:-

"گویند قوت انقطاع ایں گروہ از عنصری بدن بمرتبۂ بود کہ ہر گاہ خواستندے ازیں جدا می شدندے و جمیع علوم مشہورہ و غریبہ را از ملاء اعلیٰ فرا گرفتندے۔"

اور یہ سب افسانے شیخ بو علی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" کے آخری انماط کی تعبیر تھے، بہرحال یہ لوگ محض زردشتی نہ تھے، بلکہ فلسفہ و حکمت کے بھی عالم و ماہر تھے، فرزانہ بہرام (آذر کیوان کا جانشین) محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود کا شاگرد تھا، اس کی فلسفہ دانی کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:-

"و او مردے بود مراتب منطقیات و طبیعیات و ریاضیات و الٰہیات از پارسی و پہلوی و تازی انچہ نقل افتادہ کما وجب بسند صحیح فرا گرفتہ و نیکو خواندہ و از منقولات و معقولات بہمہ دانا، در حکمت دانشی و کردی فرزانہ رسا و فیلسوفے کامل بود۔"

لیکن اس تحریک کو ایران میں کامیابی نہیں ہوئی اور شاہ عباس نے نقطویوں پر جو سختی کی تھی اسے دیکھنے کے بعد مجوسیت کے احیاء کے سارے خواب کافور ہو گئے، اس لیے آذر کیوان اور اس کے تلامذہ ایران سے مایوس ہو گئے، مگر جب ان لوگوں کے علم و فضل اور کشف و کرامات

کے قصے اکبر تک پہنچے تو اس نے بڑے اشتیاق سے آذر کیوان کو ایران سے بلایا، مگر اس نے آنے میں دیر کی، وہ اس وقت ہندوستان پہنچا جب اکبر کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے شاگردوں میں فرزانہ بہرام خورداد، فرزانہ فرشید، موبد ہشیار، موبد سروش، فرزانہ بہرام کوچک وغیرہ مشہور ہیں، موخر الذکر کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:-

"مردے بود با خدا آرمیدہ و از خلق رمیدہ، بجمیع علوم عقلی و نقلی عالم و بزبان تازی و پارسی و ہندی و فرنگی ماہر و تصانیف شیخ اشراق شہاب الدین مقتول کہ در حکمت اشراق واقع شدہ بپارسی معروف تازی آمیز ترجمہ کردہ۔"

ان دل خوش کن قصوں نے دیگر مذاہب کے پیروؤں کو بھی آذر کیوانیوں کا گرویدہ بنا دیا، ان میں سے محمد علی شیرازی، محمد سعید اصفہانی، عاشور بیگ، محمود بیگ تین مسلمان تھے، رام بھٹ اور راجند رکھتری ہندو تھے، صاحب دبستان المذاہب نے ابوالقاسم قندرسکی کو بھی آذر کیوانیوں کا خوشہ چیں لکھا ہے، تعجب ہے کہ وہ شیخ بہاء الدین عاملی جیسے متورع و متشرع عالم کو بھی آذر کیوانیوں کے ارادت مندوں میں بتاتا ہے:-

"شیخ بہاء الدین محمد عاملی کہ از مجتہدین مردم امامیہ است۔۔۔۔۔ خود را تنجہ و بندۂ کیوان می گرفت و جویائے شاگردان ذوالعلوم می بود۔"

غرض صفوی انقلاب کی قوم پرستی نے ایرانی احیائیت پسندوں میں قدیم مذاہب کے نام پر عجیب بے راہ روی پیدا کر دی تھی، چنانچہ اس وقت پارسیوں میں راسخ العقیدہ زردشتیوں (سپاسیاں) کے علاوہ چودہ اور فرقے تھے، جن میں سے ایک "آذر ہوشنگیوں" کا تھا، جو گویا پارسی مذہب کے صوفی تھے، اور باقی میں سے بیشتر قدیم فلسفیانہ مسالک کے پیرو تھے، ہمہ اوستی فرقے نے "جمشاسپیاں" کا نام اختیار کر لیا تھا، اور سوفسطائیوں نے "سمرادیاں" کا جن کے مختلف مدارج

آخری درجہ فرہ مندیہ کا تھا، جو باری تعالیٰ کو بھی موہوم سمجھتا تھا، نعوذ باللہ منہا۔ "خدائیان" گویا صابیت کا دوسرا نام تھا، "زادیان" قدیم (Mithraism) کا احیا تھا، یہ آفتاب کی پرستش کرتے تھے، قدیم یونانی فکر کا منتہائے مقصود کائنات کے مبدء اولین کی تلاش تھا، تالیس پانی کو، انکسیمینس ہوا کو اور ایراقلیطس آگ کو جوہر اولین بتاتے تھے، جن سے کائنات وجود میں آئی ہے، لیکن کسی نے خاک کو مبدء اولین نہیں کہا تھا، مگر اس وقت مجوسیوں میں چاروں عناصر کے پرستار موجود تھے، "شیدابیان" (خاک پرست)، "الدریان" (آب پرست)، "پیکریان" (آتش پرست)، "میلانیان" (ہوا پرست) اصحاب الطبائع "شید رنگیان" تھے، اور ہیولیٰ پرست "آختیان"۔ مزدک کے پیرووں نے بھی اپنے مذہب کا احیا کرنا چاہا، مگر یہ لوگ مسلمانوں کے لباس میں رہتے تھے،

مگر ان تمام تحریکوں کو ایران میں ناکامی ہوئی، شاہ عباس صفوی کا خوف ہی ایسا غالب تھا اس لیے یہ لوگ ہندوستان چلے آئے، اور عہد اکبری کے تفلسف زدہ اور اسلام بیزار دربار نے ان کی ہر طرح ہمت افزائی کی، اکبر کی نام نہاد وسیع المشربی نے دو شکلیں اختیار کیں، اسلام بیزاری اور فلسفہ پسندی، پہلی شکل کی توضیح ہمارے موضوع سے خارج ہے، دوسری شکل کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:-

"حکم شد کہ الہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نہ کنند"۔

اگرچہ یہ حکم ناطق صرف خوشامدی درباریوں (الہیین) کے لیے تھا، مگر اس کا اثر معاشرہ پر پڑنا بھی ناگزیر تھا،

"و شنیدن مناظرۂ علماء، در میان مردم بالطبع خواندن تفسیر و فقہ برطرف شد و نجوم و حکمت و حساب و تصوف و شعر و تاریخ مقرر گشت"۔

فیضی کا ایک بڑا شاندار کتب خانہ تھا، مگر اس کی وفات پر یہ شاہی خزانہ میں داخل کیا گیا تو علوم شرعیہ کی کتابوں کو ادنیٰ درجہ میں رکھا گیا، بدایونی نے لکھا ہے:-

"در وقت گزرانیدن کتب از نظر طومار را سہ قسم ساختند اعلیٰ نظم و طب نجوم و موسیقی را قرار دادند و اوسط حکمت و تصوف و ہیئت و ہندسہ و ادنیٰ تفسیر و حدیث و فقہ و سائر شرعیات"۔

الحاد پسند شعراء کے علاوہ حکمت و معقولات کے فضلا بھی قدردانی کی تلاش میں ایران سے ہندوستان آئے، ان میں ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمام، قاضی محمد یزدی، میر مرتضیٰ شریفی زیادہ مشہور ہیں، امیر فتح اللہ شیرازی دکن سے گجرات ہوتے ہوئے آئے، ان کے علاوہ اور علماء و دیگر اقطار ہند میں تشریف لائے، جیسے شیخ حسین بغدادی، میرک عبد الباقی، مولانا عبد الخالق گیلانی نیز مولانا نجم الدین لستری۔

۱۱- گیارہویں صدی کے ایرانی فضلا میں شیخ بہاء الدین عاملی اور میر باقر داماد مشہور ہیں، شیخ بہاء الدین عاملی شیعی دینیات کے فاضل اجل ہونے کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، فن حساب میں "خلاصۃ الحساب" اور ہیئت میں "تشریح الافلاک" ان کی تصانیف ہیں بہت زیادہ مشہور ہوئے، اور ان دونوں کتابوں کو قدرت نے غیر معمولی مقبولیت بخشی، یہ دونوں رسالے ہندوستان میں داخل درس ہوئے، اور اکثر علماء نے ان کے ساتھ شرح و تحشیہ کے ساتھ اعتنا کیا،

مگر زیادہ شہرت میر باقر داماد کو ہوئی، وہ فلسفہ میں سر آمد فضلائے روزگار تھے، کلام میں "صراط مستقیم" اور فلسفہ میں "الافق المبین" ان کی مشہور تصانیف ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی کتابیں فلسفہ میں لکھیں جیسے "قبسات" وغیرہ۔

ہندوستان کے بہت سے فضلا میر باقر داماد سے پڑھ کر آئے تھے، وہ تو ان کے عقیدتمند

تھے ہی لیکن یہاں جو ان کے ہم پیشہ حریف تھے، وہ بھی ان کے علم وفضل اور دین و دیانت کے معترف تھے، قرون وسطیٰ کے ہندوستان کا واحد فلسفی ملا محمود جونپوری کو سمجھا جاتا ہے، مگر جب وہ میر باقر داماد کا ذکر کرتے ہیں تو "الحاذق البالغ الفائق السمیدع بطول الباع وعلو الکعب فی معظم اصول الفلسفۃ" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور ان کی فلسفیانہ تفکیر کی تفصیل "توغلہ فی سیاحۃ ارض الحقیقۃ وتورطہ فی سیاحۃ یم الحکمۃ وولوجہ فی اعماق ثری الملک باقدام النظارۃ الناثرۃ وعروجہ عن اطباق سماء الملکوت بقوادم انکارۃ السافرۃ" کے عنوان سے بیان کرتے ہیں،

ا۔ میر باقر داماد اپنے وقت کے عبقری اعظم تھے، انھوں نے فلسفہ حاضر الوقت کی ثروت میں نئے نئے نظریات وتصورات کا اضافہ کیا، ان میں سب سے اہم "حدوث دہری" کا مسئلہ ہے، فلاسفہ کی تقلید میں وہ حدوثِ زمان کے منکر تھے، لیکن تعلیماتِ اسلامی کا تقاضا تھا کہ وہ "حدوث عالم" کی تائید کریں، اور فلاسفہ کے "حدوث ذاتی" پر (جو قدم عالم کا دوسرا نام ہے) قناعت نہ کریں، اس لیے انھوں نے قدم زمان اور حدوث عالم کے مابین مفاہمت کی کوشش کی، وہ ہر چند کہ امام رازی سے ناراض ہیں کہ انھوں نے فلاسفہ کی "زمان دہر" اور سرمد کی تدقیق کو "تہویلات خال عن التحصیل" سے تعبیر کیا ہے، پھر بھی ان کی ملی وخاندانی غیرت خود کو "قدم عالم" کے عقیدے کے ساتھ راضی نہیں کر سکی۔ اس لیے انھوں نے "حدوث دہری" کا نظریہ تراشا، ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں لکھا ہے:۔

واعلم ان بعض خیرۃ اللاحقین بالمہرۃ السابقین مع توغلہ فی سیاحۃ ارض الحقیقۃ وتورطہ فی سیاحۃ یم الحکمۃ وولوجہ فی اعماق ثری الملک باقدام النظارۃ العاثرۃ وعروجہ عن اطباق

سماء الملکوت بقوادم انکارۃ السافرۃ اذ نبض عرقہ الہاشمی لحمایۃ ذمار الظاہر من الدین والذب عن حمی ما علیہ الجمہور من الملیین من حدوث العالم بقضہ وقضیضہ لا حدوثا ذاتیا فقط من جہۃ لحاظ الذات فحسب بل حدوثا احسن من ذلک مصداقا لسلب الوجود اصلا فی الاعیان قبل صدق الایجاب لم تترخصہ بصیرتہ النقادۃ وقریحتہ الوقادۃ ان یقول بالحدوث الزمانی للزمان ...... ابتدع القول بالحدوث الدہری والقبلیۃ الدہریۃ وقنن فی ذلک القوانین الدقیقۃ ودون الصحف الانیقۃ "

ہندوستان کے علمی حلقوں میں بھی اس مسئلہ کا رد وقبول دونوں ہی طرح استقبال کیا گیا، ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس نئے انکشاف کو سراہتے تھے، مگر مخالفوں میں بھی صف اول کے علما کے دو گروہ تھے، تفلسف پسند حضرات جن کے گل سر سبد ملا محمود جونپوری تھے، جو حدوث دہری کے منکر اور قدیم ابن سینائی قدم زمان کے قائل تھے، تاآنکہ بارہویں صدی میں ملا امان اللہ بنارسی نے دونوں فاضلوں (میر باقر داماد اور ملا محمود جونپوری) کے مابین محاکمہ کیا۔

"نظریہ حدوث دہری" کے منکرین کی دوسری جماعت متکلمین کی بھی تھی، وہ "قدم زمان" کے ساتھ "معیت دہریہ" کا بھی انکار کرتے تھے، اس جماعت کے سرگروہ خاتم المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادی تھے، جنھوں نے میر باقر داماد کے "الافق المبین" پر حاشیہ لکھا ہے، ان کے مکتب فکر نے وجود زمان کے ابطال پر اپنی توجہ خصوصیت سے مرکوز کر دی تھی، اور ان کے اس اعتنا مفرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مولانا عبدالحق خیرآبادی کو اعتراف کرنا پڑا،

" نعم وجود الزمان یشبہ ان یکون اضعف انحاء الوجود وبالجملۃ

ان ارید بنفی وجودہ نفی وجودہ علی سبیل التحصیل کان ذالک

حقا لانہ لیس لہ البتۃ وجود کذالک فی الاعیان"

ب - اس وقت ایران میں شاہ عباس صفوی کی سخت گیری کے باوجود فلسفہ کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی تھی، اور پھر فارابی اور ابن سینا کی عظمت و احترام کی طرف طبیعتیں مائل تھیں، امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں فارابی و ابن سینا کی بالواسطہ تکفیر کی تھی، اور حسب ذیل عقائد کو کافرانہ بتایا تھا: قدم عالم، باری تعالیٰ کے علم بجزئیات حادثہ کا انکار اور معاد جسمانی کا انکار۔ اس لیے فلسفہ کے نشأۃ ثانیہ کے ساتھ ایران میں ان مسائل کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا، اور لوگ امام غزالی کی عظمت فکر کے باوجود ان کے اس تکفیری موقف کے ساتھ اتفاق کرنے سے قاصر پاتے تھے،

گیارہویں صدی کے وسط میں یہ ماحول تھا کہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں نے جان سپار خاں کو سفیر بنا کر ایران بھیجا، اس سفارتی وفد کے عملہ میں محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس تھے، ان دونوں کو اپنی معقولات دانی کا غرہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفۂ سلطان سے جو اعلم علمائے عراق تھے، الجھ پڑے، خلیفۂ سلطان نے وقت کی اس اہم بحث کے سلسلے میں پوچھا کہ امام غزالی نے جو مسائل ثلثہ میں فارابی و ابن سینا کی تکفیر کی ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، محمد فاروق اور محب علی کوئی شافی جواب نہ دے سکے، چنانچہ وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام جو مکتوب بھیجا تھا، اس میں لکھا ہے:-

از افواہ وقائع ایران زمین بمسامع حقایق مجامع رسید کہ افادت پناہ افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانش در عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ با مارت آب جاں سپار خاں سفیر متعین اند، پس از

دعوائے ایشاں بفضل و کمال پرسیدہ باشد کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جل امرہ کبیرا بجزئیات مادیہ حادثہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی و شیخ ابوعلی سینا نمودہ و جمیع تاویل کلام حکما کردہ اند، ایں مراتب را تقریر باید کرد، مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند"

بہرحال جب شاہجہاں کو اس کی اطلاع ملی تو بڑا صدمہ ہوا، اور اس کے ایماء سے وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی سے موضوع زیر بحث پر ایک سیر حاصل بحث لکھنے کی درخواست کی، چنانچہ سعد اللہ خاں نے اپنے محولہ بالا مکتوب میں آگے چل کر لکھا ہے:-

"لہذا کمترین مریداں حکم شد کہ آں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند بر نگارد و برگزارد کہ آں افادت و افاضت مرتبہ دادریں مسائل مختصرے جامع و موجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما، و تاویلات علما، و وجہ تکفیر اسلامیین و اقوال ملیین و مباحث و مناظرات و شکوک و شبہات و ازالات و ازاحات و اسولہ و اجوبہ و غایت تدقیقات و نہایت تحقیقات و اصل کلام در ہر باب و اساس سخن در ہر جواب و آنچہ براں ظفر یافتہ باشند و برہان کہ بداں فائز شدہ باشند و احاطہ مسائل متعلقہ بایں مطلب علمی از حضوری حصولی و بودن علم عین عالم عین معلوم با عتراف تعلق بجزئیات بر وجہ کلی است یا جزئی و تحریر آنکہ جزئیت و کلیت مفہوم تابع مدرک است یا تابع مدرک، و یا واجب جزئی ہست یا نہ۔ و بیان آنکہ ادراک تعلقے است و احاطہ ست و شمول علم بمغیبات و مشخصات از زماں و غیر آں و بقاء علم بعلوم با تبدل زمان و حضور زمان بجمیع اجزا، من ازل الآزال الی ابد الآباد و مع کونہ غیر قارۃ چنانکہ باشد نوشتہ در حضرت خلافت در عرض دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ با ایران فرستادہ شود و آنچناں باید بود کہ قابل فرستادن باشد و لایق اضافہ بآں فضائل دستگاہ بو

ودر روزگار ازاں یاد گویند ودر تاریخ نامہ ہا نوشتہ شود"

اس استدعا کے نتیجے میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے اپنا مشہور رسالہ "الدرۃ الثمینۃ" تصنیف کیا، اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :-

"یقول العبد المسکین عبد الحکیم ابن شمس الدین ھذہ قواعد عالیۃ وفوائد غالیۃ نظمتہا القلوب ھادیۃ وآذان واعیۃ بامر الملک المتعام ..... ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب القران الثانی ..... اللھم کما فضلتہ بالسلطنۃ الکبری فی الدنیا متعہ بالسعادۃ العظمٰی فی العقبیٰ"

یہ رسالہ حسب درخواست سعد اللہ خاں وزیر تین مباحث پر مشتمل ہے، علم باری، حشر جسمانی و روحانی اور قدم وحدوث عالم، لیکن ان میں زیادہ اہم علم باری کا مسئلہ ہے، اور رسالہ کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے، اس میں تین بحثیں ہیں جیسا کہ علامہ نے لکھا ہے :-

"القول فی علمہ تعالیٰ وفیہ ابحاث: الاول فی اثباتہ ..... البحث الثانی فی ان علمہ ما ھو وکیف ھو ..... البحث الثالث فی عموم علمہ تعالیٰ"

اس کے بعد "علم باری" کا مسئلہ علمی حلقوں میں گرمی محفل کا سامان بنگیا، اکثر علمائے نامدار نے اس پر طبع آزمائی کی، اسی رجحان سے متاثر ہو کر ملا محب اللہ بہاری نے سلّم میں لکھا "سبحانہ ما اعظم شانہ لا یحد ولا یتصور" اور اس طرح یہ مسئلہ شراح "سلم العلوم" کی کاوش وتحقیق کا موضوع بن گیا، ہر شارح اور محشی نے دل کھول کر اسکی داد تحقیق دی، بعد میں بعض علماء نے اس موضوع (مسئلہ علم باری نیز مسئلہ علم) پر مستقل رسائل لکھے، اس قسم کے کچھ رسالے اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

مگر یہ سب کچھ ایران کی علمی بحثوں اور وہاں کے علمی رجحانات کا تسلسل تھا، جو ہندوستانی فکر میں اس طور سے منعکس ہو رہا تھا۔

ج۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی علمائے ایران ہندوستان آتے رہے، ان میں شیخ ابو تراب شیرازی، سید تقی الدین شیرازی، شیخ جمال الدین شیرازی، شیخ تقی الدین تستری، سلطان حسین یزدی، ملا فرخ ہروی، مولانا کمال الدین نیشاپوری، حکیم محمد معصوم تستری، میر محمد ہاشم گیلانی، ملا مرشد شیرازی زیادہ مشہور تھے، ان میں سے بعض لوگ براہ راست دربار شاہی میں آکر ملازم ہوئے، بعض گجرات رہ گئے، بعض دکن چلے گئے، ان میں سے اکثر فضلاء سے علمائے ہند کے مناظرے بھی رہے، ملا شفیعا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا مناظرہ مشہور ہے، امام الدین الریاضی نے لکھا ہے :

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود وخطاب دانشمند خاں یافتہ بود طلبید۔ ایشاں آمدند واجلاس علما وفضلا وحکما حکم شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مباحثہ واقع شد بر مراد ایالک نعبد وایالک نستعین گفتگو بطول کشید وبالآخر درستی قول مولوی و راستی سخن ایشاں بر پادشاہ وسائر امراء وعلمائے عالی شان در ظہور انجامید"

د۔ شاہجہاں کی سیاسی فتوحات کے نتیجے میں بلخ بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا اور یہاں کے علما بھی ہندوستان پہنچے، ان میں سب سے مشہور مولانا عوض وجیہ بلخی تھے، ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے، اور علامہ عبدالحکیم کے درس میں بھی گئے مگر سپاہیانہ وضع میں تھے، اسلیے کوئی پہچان نہ سکا، اثنائے درس میں علامہ کی تقریر پر جو ایرادات کرنا شروع کیے تو علامہ سے جواب دیتے نہ بنا، کچھ دن بعد سعد اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور یہ قصہ سنایا، سعد اللہ خاں سمجھ گئے کہ وہ مولانا عوض وجیہ تھے، جب علامہ کو معلوم ہوا تو بکمال حسرت فرمانے لگے

" از آمدنش اگر خبر داشتمے در رہ گذرش گل وسمن کاشتمے "

۱۲۔ اس مختصر جائزے میں ایران کے ان شعراء سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جو قدر دانی کی تلاش میں ہندوستان آئے، مغل عہد تو ان نو وارد ایرانی شعراء کے ورود کیلیے مشہور ہے۔

گو یہ سلسلہ مغل عہد کے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، آخری زمانہ میں شیخ علی حزیں تشریف لائے، مگر ہمارے یہاں بدقسمتی سے وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں، اور ہم ان کے کمال کی اس سے زیادہ داد نہ دے سکے کہ

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو | فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

ان کی فکر کا زائیدہ تھا، حالانکہ وہ شاعر سے زیادہ عالم اور معقولی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں مندرجۂ ذیل کتابیں اپنی تصانیف بتائی ہیں، جو فلسفہ و حکمت کی مطولات سے متعلق ہیں: شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق، رسالہ ابطال تناسخ برائے طبیعیین، رسالہ کنہ المرام در قضا و قدر، حاشیہ بر الٰہیات شفا، حاشیہ بر امور عامہ شرح تجرید، حواشی بر شرح حکمت اشراق، حاشیہ بر شرح ہیاکل النور، رسالہ تجرد نفس، رسالہ لوامع مشرقہ در تحقیق معنی واحد و وحدت، رسالہ موسومہ بتوفیق در توافق حکمہ و شریعہ، رسالہ توجیہ کلام قدما و حکماے مجوس در مبدء عالم

یہ مختصر تذکرہ ہے، ہند و ایران کے علمی و ثقافتی روابط کا جس کا آغاز صدر اسلام سے ہوتا ہے اور خاتمہ شیخ علی حزیں کی آمد پر۔ یہ ایک ہی ثقافت کے دو علمبردار ملکوں کا اختلاط تھا، جسے ایران میں وقتاً فوقتاً کسی نئے عبقری کا ظہور زیادہ نمایاں کر دیتا تھا، بہرحال یہ ایک حقیقت ہے، اگر جب ہم تکلف "انڈو ایرانین کلچرل ریلیشنز" کی تجدید کرتے ہیں، تو اپنی ادعائی تحقیق و کاوش کی نمایش کے لیے خواہی نخواہی اس درخشندہ و تابندہ حقیقت پر تکلفات کے پردے ڈالنے کی کوشش کیا کرتے ہیں، مگر ہمارا یہ تکلف آخر کار مضحکہ خیز ہی ثابت ہوتا ہے۔

برکلے اور اس کا فلسفہ

مشہور فلاسفر برکلے کے حالاتِ زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح، اردو میں فلسفہ جدیدہ کی پہلی کتاب ہے:- قیمت:- عہ

منیجر

ابو عثمان جاحظ

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

جاحظ ایک فلسفی اور آزاد مشرب انسان تھا، مذہبی عقائد و خیالات میں بھی وہ غیر محتاط تھا، لیکن عربی زبان و ادب کا مشہور صاحبِ طرز ادیب، نامور انشاء پرداز، فلسفہ و کلام کا امام اور بہت سی کتابوں کا مصنف ہے، اس کی تصنیفات ادب و انشاء کا شاہکار اور عربی زبان و ادب میں لازوال شہرت رکھتی ہیں، اس لحاظ سے اس کی شخصیت بڑی اہم ہے، مورخین اور اس کے معاصر مصنفین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، مگر اردو میں ابھی تک جاحظ کے حالات نہیں لکھے گئے ہیں، تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہوئے ہیں، انھیں اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے۔

نام و نسب اس کا نام عمرو، باپ کا بحر اور دادا کا محبوب تھا، ابو عثمان کنیت، جاحظ لقب اور کنانی لیثی، معتزلی اور بصری وغیرہ نسبتیں ہیں۔[1]

جاحظ لقب کا سبب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں نکلی اور ابھری ہوئی تھیں، عربی زبان میں ایسے شخص کو جاحظ العینین کہا جاتا ہے، اس لیے جاحظ لقب پڑ گیا، اسی مناسبت سے اسے حدقی بھی کہا جاتا ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حکایت بیان کیجاتی ہے، وہ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر گیا اور اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی، ایک عجمی لڑکا باہر آیا،

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات النحاۃ واللغویین ص ۳۶۵ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۲ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹

اور پوچھا آپ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا میں جاحظ ہوں، لڑکے نے اندر جاکر کہا، جاحد دروازے پر کھڑا ہے، صاحب خانہ نے کہا پھر جاکر ٹھیک ٹھیک پوچھو، دوبارہ جاحظ نے کہا میں حدقی ہوں، لڑکے نے اندر جاکر کہا اس کا نام حلقی ہے، جاحظ نے دونوں بار لڑکے کی گفتگو سن لی تھی، جب اس نے حلقی کہا تو وہ زور سے چلایا، "ردنا الی الاول" یعنی جاحظ کے بجائے جاحد تو میں اپنا نام سن لینا گوارا کرسکتا ہوں مگر حدقی کے بجائے حلقی سننا کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ صاحب خانہ یہ چیخ پکار سنکر جاحظ کو پہچان گیا اور خود آکر اسے اندر لواگیا اور عذر و معذرت کی۔[1]

وطن | بصرہ قدیم زمانہ سے عراق (عرب) کا مشہور و متمدن شہر ہے، اور اس کی مردم خیز سرزمین سے بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے ہیں، جاحظ جیسے ماہر ادیب و انشاپرداز کا مولد و منشاء ہونے کا فخر بھی اسی مردم خیز خطہ کو حاصل ہے۔

پیدائش | جاحظ کے سنہ ولادت کے متعلق اگرچہ اصحاب تذکرہ و طبقات نے کوئی واضح تصریح نہیں کی ہے، لیکن جاحظ کا خود بیان ہے کہ وہ ابونواس سے عمر میں تقریباً ایک سال بڑا ہے۔ اسکی پیدائش ۱۵۰ھ کے شروع میں اور ابونواس کی اسی سال کے آخر میں ہوئی تھی،[2] مگر احمد امین نے جاحظ کے اس بیان سے کہ

واشد ما علی ست وتسعون	میرے لیے سب سے زیادہ شاق بات یہ ہے
عاماً[3]	کہ میں ۹۶ سال کا بوڑھا ہوگیا ہوں،

اس کا سنہ پیدائش ۱۵۹ھ بتایا ہے، کیونکہ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے بموجب اس کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی تھی۔

خاندان | جاحظ خاندانی اعتبار سے کوئی ممتاز شخص نہ تھا اس کی نسبت کنانی علمی اور حقیقی نہ تھی،

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۵۶ [3] مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۴ و دیگر کتب۔

بلکہ ابوالقلمس عمرو بن قلع کنانی کا غلام تھا، اور اس کا دادا اونٹوں کی چرواہی کرتا تھا، اس نے خود بھی اونٹ چرائے تھے،[1] اور سیحان میں روٹی اور مچھلیاں بیچتا تھا، ڈاکٹر احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں:

ولم تکن اسرتہ بوضیعۃ القدر	اس کا خاندان معزز اور بلند مرتبہ نہ تھا
ولا سامیۃ المکانۃ بل علی	بلکہ عمرو بن قلع کنانی کا خدمت گذار
النقیض کانت خدما وخولا	اور غلام تھا،...... کہا جاتا ہے کہ اسکا
لمولاھم ابی القلمس عمرو بن	دادا فزارہ اونٹوں کا گلہ بان تھا،
قلع الکنانی... وقیل ان	اور وہ خود سیحان میں روٹی اور
فزارۃ جد الجاحظ کان جمالاً	مچھلی بیچا کرتا تھا،
وان الجاحظ نفسہ کان	
یبیع الخبز والسمک بسیحان[2]	

لیکن علم و فضل کو خاندانی شرافت و نجابت سے کوئی تعلق نہیں، تاریخ اسلام کی بیشمار ایسی شخصیتیں مملوک اور غلام زادہ تھیں، جاحظ کا فضل و کمال اور شہرت و ناموری بھی اسکی فطری استعداد و قابلیت، ذہانت و طباعی اور شوق و محنت کا نتیجہ ہے۔

اساتذہ و شیوخ | تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں جاحظ کے چند ہی اساتذہ کا نام ملتا ہے، لیکن وہ سب اپنے فن میں یکتا تھے، اور ان کی عظمت خود مستقل مضمون کی متقاضی ہے، اس لیے اس مضمون میں صرف ان کے ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جاحظ فلسفہ و کلام کا استاد ہے، اور اس فن کی تحصیل اس نے عقلی علم کلام کے بانی اول اور مشہور متکلم ابوالہذیل العلاف کے نامور شاگرد اور جانشین ابواسحٰق ابراہیم بن سیار بلخی المعروف[3]

---

[1] نزہۃ الالبا ص ۲۵۵ [2] عصر المامون ج اول ص ۱۲۴ [3] الغزالی ص ۹۲

بالنظام (المتوفی ۲۳۵ھ) سے کی تھی، نظام کی عظمت واہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے یہ بات کافی ہے کہ وہ علاف کا شاگرد اور جاحظ کا استاد تھا، مولانا شبلی فرماتے ہیں:-

"نظام کے فضل وکمال کی بلند پائیگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جاحظ جیسا بے نظیر فاضل اسی نظام کا شاگرد اور خانہ زاد غلام تھا"[1]

جاحظ لغت وادب کا بھی بڑا اداشناس بلکہ امام ادب تھا، ان فنون میں اس کو ابوعبیدہ معمر بن مثنی (متوفی ۲۰۹ھ) ابوسعید عبد الملک بن قریب اصمعی متوفی ۲۱۶ھ اور ابوزید سعید بن اوس انصاری متوفی (۲۱۵ھ) جیسے ائمہ اور اساطین فن سے نسبت تلمذ حاصل[2] ابوالحسن سعید بن مسعدہ اخفش (متوفی ۲۱۶ھ) جیسے فاضل اور امام نحو سے علم نحو میں اکتساب فیض کیا تھا۔

علم حدیث میں گو جاحظ کا کوئی مقام نہیں، تاہم یزید بن ہارون، سری بن عبدویہ، قاضی ابویوسف اور حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ سے اس نے روایتیں کی ہیں[3]، صاحب شذرات نے ایک اور استاد ثمامہ بن اشرس کا بھی ذکر کیا ہے[4]، عربی زبان وادب اور فصاحت وبلاغت سیکھنے کے لیے وہ خالص بدوی عربوں کے پاس جاتا اور براہ راست ان سے اسے سیکھتا تھا[5]۔

تلامذہ مورخین اور اصحاب طبقات نے جاحظ سے استفادہ کرنے والوں کے محض چند ہی نام گنائے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

یموت بن مزرع جو اس کا بھانجا تھا، ابوبکر عبد اللہ بن ابی داؤد سجستانی، محمد بن عبد اللہ بن ابی الدلہاث اور محمد بن یزید نحوی وغیرہ نے اس سے روایت کی ہے[6]۔

لیکن جاحظ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اتنی کم نہیں ہوسکتی، یہ صرف اس سے حدیثیں

---

[1] الکلام حصہ اول ص ۳۹ [2] کتاب الانساب سمعانی ص ۱۱۸ [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ [4] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۷ [5] کتاب الانساب سمعانی ص ۱۱۸ و ۱۱۹۔

روایت کرنے والے رواۃ کا نام ہے، لغت وادب اور کلام میں اس سے استفادہ کرنے والے ان کے علاوہ ہیں، خود مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ جاحظ کے درس میں شریک ہونے والوں کا ایک جم غفیر رہتا تھا۔

سفر وسیاحت تحصیل علم کے لیے جاحظ کے سفر وسیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن اس کی کتابوں میں مختلف قوموں اور ملکوں کے معاشرت، تہذیب اور تمدن وغیرہ کے متعلق جو معلومات ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یا تو متعدد ملکوں کے سفر کیے ہوں گے یا دوسرے ذرائع سے ان کے متعلق واقفیت اور آگاہی حاصل کی ہوگی، لیکن سر من رای، دمشق، بغداد اور انطاکیہ وغیرہ جانے[1] اور وہاں کے اہل علم وفضل سے استفادہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، اور بغداد میں تو اس نے مدتوں قیام کیا تھا، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں:-

وقدم بغداد فاقام بہا مدۃ[2] — جاحظ بغداد آیا اور وہاں ایک عرصہ تک قیام کیا۔

علم کا ذوق اور اسکی حرص جاحظ کو علم وفن سے خاص مناسبت تھی، اس کا تمام وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، وہ اپنے اعتزال وانحراف اور بدعقیدگی کی بنا پر جس الزام اور ملامت کا بھی مستحق سمجھا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی جیسی علمی حرص کی مثالیں کم ہیں، اس کی معاشی پریشانیاں بھی طلب علم کی راہ میں حائل نہ ہوسکیں، احمد امین لکھتے ہیں:-

"عباسی عہد کے نوجوانوں میں جاحظ کی طرح شاید ہی کسی نے علم کا اکتساب کیا ہو، وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھا، کہا جاتا ہے کہ سیحان میں لوگوں نے اسے روٹی اور مچھلی فروخت کرکے گذر اوقات کرتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس اثنا میں بھی وہ ہر طبقہ وخیال کے علماء سے ملتا اور ان سے استفادہ کرتا رہا"[3]

---

[1] ضحی الاسلام ج اول ص ۳۰۸ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۳ [3] ضحی الاسلام ج اول ص ۳۰۸

اور مشہور ادیب و انشا پرداز ابو العباس مبرد بیان کرتا ہے کہ "میں نے تین اشخاص جاحظ، فتح بن خاقان اور اسمٰعیل بن اسحاق قاضی سے زیادہ علم کا شائق اور حریص نہیں دیکھا، جاحظ کا یہ حال تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیسی ہی کتاب بھی آجاتی اسے اول سے آخر تک پڑھ ڈالتا، [1]

ابو ہفان بیان کرتے ہیں کہ جاحظ سے زیادہ علم اور مطالعۂ کتب کا شائق : میری آنکھوں نے دیکھا نہ میرے کانوں نے سنا، اسے جب کوئی کتاب مل جاتی تو اس کو پڑھ کر دم لیتا تھا، یہانتک کہ وراقوں کی دکانوں کو کرایہ پر لیتا اور مطالعۂ کتب کے لیے ان ہی میں رات گذارتا تھا، [2]

عربی زبان و ادب اونٹ چرانے والے بدوؤں اور عربوں کے پاس جاکر ان سے بالمشافہ سیکھا[3] مطالعہ اور کتب بینی کی ایسی چاٹ پڑگئی تھی کہ آخر عمر میں جب قوت جواب دے چکی تھی اور ضعف پیری حد سے بڑھ گیا تھا، اس وقت بھی کتابوں کا مطالعہ حسب معمول جاری تھا، اس کی موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کتابوں کا ڈھیر اس کے اوپر گر پڑا تھا[4]، ابو الفداء کا بیان ہے

وقد روی ان موته کان بوقوع مجلدات علیه وکان من عادته ان یصفها قائمة کالحائط محیطة به وھو جالس الیھا وکان علیلا فسقطت علیه فقتلته [5]

بیان کیا گیا ہے کہ جاحظ کی موت اس کے اوپر کتابوں کے ڈھیر کے گر جانے سے ہوئی تھی، اسکا معمول تھا کہ وہ دیوار کی طرح اپنے ارد گرد کتابوں کو کھڑی کر دیتا تھا اور ان کے بیچ میں خود بیٹھتا ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں اسی طرح بیٹھا تھا کتابیں اس کے اوپر [illegible]

صاحب اعلام تحریر فرماتے ہیں:-

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۱۶۹ و امالی حصہ اول ص ۱۳۸، [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۲ [5] تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۴۴

ومات والکتاب علی صدرہ [1]

اسکی موت اس حال میں ہوئی کہ کتاب اسکے سینہ پر تھی،

ذہانت وطباعی علم کے ذوق وطلب کے ساتھ وہ ذہانت وطباعی میں بھی ممتاز تھا، اور اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یاقوت حموی کا بیان ہے :-

وکان الجاحظ من الذکاء وسرعة الخاطر والحفظ بحیث شاع ذکرہ وعلا قدرہ واستغنی عن الوصف [2]

جاحظ کی ذکاوت و ذہانت اور قوتِ حفظ اتنی مشہور ہے کہ وہ محتاجِ توصیف نہیں،

جاحظ کے فضل وکمال کا اعتراف تمام مورخین اور اصحابِ طبقات اس کے علمی کمالات کے معترف ہیں، علامہ سمعانی کا بیان ہے :-

وکان فصیحا تدل کتبه علی فصاحته وملاحة عبارته [3]

جاحظ فصیح تھا، اسکی کتابیں اسکی فصاحت اور اس کے حسن تحریر کا ثبوت ہیں،

ابو البرکات انباری لکھتے ہیں،

فانه کان عالما بالادب فصیحا بلیغا مصنفا فی فنون العلم وکان من ائمة المعتزلة [4]

وہ ادب کا عالم، فصیح و بلیغ، مختلف فنون میں صاحب تصنیف اور معتزلہ کے ائمہ میں تھا،

علامہ ابن کثیر جاحظ کے اعتزال اور بدعقیدگی کی مذمت اور تردید کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وکان ماہرا فاضلا قد اتقن علوما کثیرة وصنف کتبا جمة

لیکن وہ ماہر و فاضل اور متعدد علوم میں کامل تھا، اس نے بیشمار کتابیں لکھیں

---

[1] اعلام ج ۲ ص ۲۹ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶ [3] کتاب الانساب ص ۱۱۹ [4] نزہۃ الالبائی طبقات الادباء ص ۲۵۴

تدل علی قوۃ ذهنه وجودۃ تصرفه[1]

جن سے اسکی ذہانت اور جودتِ طبع کا ثبوت ملتا ہے،

ابوبکر احمد بن علی کا بیان ہے:-

كان ابو عثمان الجاحظ من اصحاب النظام وكان واسع العلم بالكلام كثير التجر فيه شديد الضبط لحدوده ومن اعلم الناس به وبغيره من علوم الدين والدنيا[2]

ابو عثمان نظام کا شاگرد، علم کلام کا ماہر و متبحر، اس کے حدود کا مبصر اور دوسرے علوم کا بہت بڑا عالم تھا،

یاقوت حموی لکھتا ہے:-

والجاحظ عظيم القدر في المعتزلة وغير المعتزلة من العلماء الذين يعرفون الرجال ويميزون الامور[3]

معتزلہ وغیر معتزلہ دونوں کے نزدیک جاحظ عظیم المرتبت ہے، وہ ان علمائے فن میں سے ہے جو رجال کے ماہر اور معاملات و مسائل کی پرکھ رکھتے ہیں۔

ابن خلکان اور یافعی نے اس کو العالم المشہور (مشہور عالم) اور صاحب التصانیف المفیدہ فی فنون عدیدہ (متعدد فنون میں عمدہ اور مفید تصنیفات والا) کے اوصاف سے یاد کیا ہے[4]

صاحب شذرات فرماتے ہیں:-

كان بحرا من بحور العلم[5]

وہ علم کے سمندروں میں سے ایک سمندر تھا،

صاحب اعلام لکھتے ہیں:-

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۹ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۵۶ [3] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۲ [5] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱

كبير ائمة الادب ورئيس الفرقة الجاحظية من المعتزلة[1]

جاحظ ادب و عربیت کا امام کبیر اور معتزلہ کے فرقہ جاحظیہ کا رئیس تھا،

ابو حیان، ابن مقسم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو ہفان کی مجلس میں جاحظ کا تذکرہ ہو رہا تھا، ایک شخص نے ان سے کہا وہ آپ کا ہم پایہ اور ہمسر بنتا ہے، آپ اس کی ہجو کیوں نہیں کرتے، ابو ہفان نے کہا کیا مجھے بھی فریب دیا جا سکتا ہے، قسم ہے خدائے ذوالجلال کی کہ اگر جاحظ ایک رسالہ میری ناک کے متعلق بھی تحریر کر دے تو چین تک اس کی شہرت ہو جائیگی، لیکن اگر میں اس کے بارہ میں ہزار اشعار بھی کہوں تو ایک شعر کا بھی ایک ہزار برس میں کوئی چرچا نہ ہوگا،[2]

ثابت بن قرہ صابی کا بیان ہے کہ مجھے ملت اسلامیہ کے صرف تین اشخاص پر رشک آتا ہے

ان النساء بمثله عقم عقم النساء فلا يلدن شبيهه

عورتیں بانجھ ہو گئیں اسلیے اس جیسا آدمی نہیں جن سکتیں اور واقعی اس جیسا آدمی جننے سے عورتیں بانجھ ہی ہیں،

لوگوں نے پوچھا یہ تین اشخاص کون ہیں؟ اس نے کہا عمر بن خطاب ..... حسن بصری[3] ..... اور جاحظ جو مسلمانوں کا خطیب و انشاء پرداز، متکلمین کا شیخ، جدل و مناظرہ میں نظام کا مثیل و ہم پایہ، جد و ہزل دونوں میں یکتا اور ادب و عربیت کا امام ہے، اس کی کتابیں شگفتہ و شاداب چمن اور رسالے برگ و بار آور شاخیں ہیں، خلفاء و امراء کا ندیم و ممدوح، علماء کا ماخذ و مرجع، خواص کا معتمد، عوام کا محبوب، زبان و قلم، نظم و نثر، علم و ادب، ذہانت و فراست، فہم و تدبر اور حزم و تدبیر سب میں جامع تھا، اس نے طویل عمر پائی اور اس کی حکمت و دانش کی عام شہرت ہوئی،

---

[1] اعلام ج ۲ ص ۷۲۹ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۱ [3] اصل ماخذ میں حضرت عمر بن خطابؓ اور حسن بصری کی خصوصیات بھی درج تھیں لیکن انھیں طوالت کے خوف سے قلم انداز کر دیا گیا،

لوگوں نے اس کے نقش قدم کا تتبع کیا اور اس کی طرف نسبت کو فخر سمجھا، اور اسے حکمت و خطابت کا زبردست ملکہ عطا ہوا تھا۔[1]

جامعیت وکمال | جاحظ اقلیم علم وفن کا شہنشاہ اور اس کی شخصیت گوناگوں اور متنوع کمالات کی جامع ہے، اس نے ہر موضوع اور ہر فن میں طبع آزمائی کی ہے، شعر و ادب، انشا، و بلاغت، نحو و لغت، فلسفہ و کلام اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم پر اس نے کتابیں لکھی ہیں، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:-

صاحب التصانیف فی کل فن[2]	جاحظ کی ہر فن میں تصنیفات ہیں

احمد امین اس کی جامعیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جاحظ نے تقریباً ہر موضوع سے تعرض اور اعتنا کیا ہے، مدرسین و معلمین سے لیکر بنی ہاشم، چوروں سے لیکر بھیڑیوں، صفات الٰہی سے لیکر رقص و سرود اور مغنیات، قاضیوں اور والیوں سے لیکر امہات الاولاد اور امامت و خلافت سے لیکر حوروں تک کونسا موضوع ہے جو اس کے احاطۂ تحریر میں نہ آیا ہو، اس لیے اگر جاحظ کی تصنیفات کو جو اگرچہ نظم و ترتیب سے عاری ہیں، ان کی جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔"[3]

وہ علم وفن کے عروج و کمال کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا، اس وقت عباسی خلفاء کی علم پروری اور ادب نوازی کی وجہ سے مختلف قوموں اور ملکوں کے علوم و فنون سے عربی زبان مالا مال ہو رہی تھی، اسلیے جاحظ کو عربی تہذیب و تمدن کے علاوہ ایرانی، ہندوستانی اور یونانی وغیرہ کی تہذیب و ثقافت سے بھی واقف ہونے کا موقع ملا، اور اس نے ارسطو، ابن مقفع اور دوسرے علما کلام

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۷۰، ۷۱، [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۸، [3] ضحی الاسلام ج اول ص ۳۸۸

کی تصنیفات کی بدولت نہ صرف مختلف قوموں کے معاشرت و تمدن، ان کی خصوصیات، آب و ہوا، قدرتی حالات اور جغرافیائی کیفیات سے واقفیت حاصل کی، بلکہ مختلف فرقوں اور مذاہب کا بھی اس نے مطالعہ کیا، اور اس کی کتابوں میں ثنویت، زرتشتیت، دہریت، ہندویت، یہودیت، نصرانیت اور اسلام سب کا ذکر موجود ہے۔

بعض علوم میں امتیاز | جاحظ کو اگرچہ مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل تھا، لیکن نحو، لغت، ادبیت، انشاء، اور کلام کا امام اور ان فنون میں یگانہ و یکتا تھا، متقدمین اور متاخرین میں بہت کم لوگ ان میں اس کے ہم پایہ تھے، اسی لیے مورخین اور اصحاب سیر اسے اللغوی، النحوی، کبیر ائمۃ الادب، المتکلم المشہور اور احد شیوخ المعتزلہ وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، احمد فرید رفاعی لکھتے ہیں:-

وغلب علیہ امران اثنان:	دو چیزوں سے اس کو خاص شغف تھا، ایک
الکلام علی طریقۃ المعتزلۃ و	طریقۂ معتزلہ کے مطابق بحث و نظر دوسرے
الادب ممزوجا بالفلسفۃ والفکاھۃ[1]	فلسفہ و ظرافت آمیز ادب

ابو الفضل بن عمید کا بیان ہے:-

"تین علوم میں سب لوگ تین اشخاص کے محتاج ہیں، فقہ میں امام ابو حنیفہ کے، کلام میں ابو الہذیل کے اور فصاحت و بلاغت اور ادب و عربیت میں ابو عثمان جاحظ کے"۔[2]

جاحظ اور روایت حدیث | جاحظ کسی زمانہ میں بھی عالم دین کی حیثیت سے معروف و مشہور نہ تھا، بلکہ یہ بدعقیدگی کے لیے مشہور ہے، چنانچہ علما اسے ثقہ و معتبر نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کو دوسرے علوم و فنون کی طرح علم و روایت حدیث کا بھی شوق تھا، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس کے حوالہ سے چند روایتیں نقل کی ہیں اور وہ یہ ہیں:-

[1] عصر المامون ج اول ص ۴۲۲، [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۳،

اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی طنفسۃ من کل ماسقط من الخوان فوزق اولاد اکانوا صباحا[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کے بعض فاسد خیالات گمراہی پر مبنی ہیں، تاہم اسے مذہب سے تعلق تھا، اور اس نے متعدد مذہبی مسائل نظم قرآن، اثبات نبوت اور فقہ وافتا وغیرہ پر کتابیں لکھی ہیں،

شعر و سخن | جاحظ شعر و سخن کا بھی بلند مذاق رکھتا تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا، حماز وغیرہ کی ہجویں اسکے اشعار ملتے ہیں، وہ موقع بموقع اپنی کتابوں میں اشعار نقل کرتا ہے، انھیں بطور استشہاد پیش کرتا ہے، شعر و سخن کے محاسن اور خصوصیات پر دوسرے ادیبوں سے مباحثہ اور مذاکرہ بھی کرتا تھا، مبرد کا بیان ہے کہ جاحظ نے ایک روز مجھ سے پوچھا کہ تم کو اسمٰعیل بن قاسم کے اس شعر کے ایسا کوئی شعر یاد ہے:

ولا خیر فیمن لا یوطن نفسہ علی نائبات الدھر حین تنوب

جو شخص حوادث روزگار کو انگیز کرنے کا خوگر نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں،

میں نے کہا ہاں کثیر کا شعر اسی مفہوم میں ہے:

فقلت لھا یا عز کل مصیبۃ اذا وطنت یوما لھا النفس ذلت[2]

میں نے کہا اے عزہ ہر درد و الم کا جب آدمی خوگر ہو جاتا ہے تو وہ آسان ہو جاتا ہے۔

یموت بن مزرع کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ماموں جاحظ سے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ابو نواس کے ان شعروں سے بہتر اشعار ان کی نظر سے نہیں گذرے، پھر انھوں نے آٹھ شعر پڑھے، جس کا مطلع یہ تھا:-

ودار ندامی عطلوھا وادلجوا بھا اثر منھم جدید ودارس

اس کا بیان ہے کہ میں نے ابو شعیب قلال کے سامنے یہ اشعار پڑھے، تو انھوں نے کہا ابو عثمان

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۲۱۴ [2] امالی ج اول

اگر ان میں کوئی یہ کہہ دے تو ان کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جائے گا، میں نے کہا افسوس آپ کو گھڑے اور ٹھیکریوں کا فرق نہیں معلوم[1]

حکمت و دانائی | جاحظ ایک حکیم و دانا انسان بھی تھا وہ اکثر بڑی سنجیدگی اور حکمت کی باتیں بھی کرتا تھا، اس کے بہت سے حکیمانہ مقولے اس کی کتابوں میں ملتے ہیں مبرد کا بیان ہے کہ جاحظ نے کہا کہ:-

احذر من تامن فانک حذر ممن تخاف[2] جس سے تم کو اطمینان ہو اس سے چوکنے رہو کیونکہ جس سے تمھیں خوف ہوتا ہے اس سے تو ہوشیار رہتے ہی ہو،

ایک مرتبہ اس نے کہا کہ جب کسی سے یہ بات سنو کہ "ما ترک الاول للآخر شیئا" یعنی متقدمین نے متاخرین کے لیے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی، تو سمجھ لو کہ وہ کام کرنا اور کامیاب نہیں ہونا چاہتا،[3]

یموت بن مزرع جاحظ سے روایت کرتے ہیں کہ آدمی کی سخاوت اسی وقت تک قابل تعریف ہے جب تک وہ اسراف اور تبذیر کی حد کو نہ پہنچے، شجاعت اسی حد تک پسندیدہ ہے کہ وہ ہوج نہ بنجائے، احتیاط اتنی ہی ہونی چاہئے کہ اس کو جبن (بزدلی) نہ کہا جا سکے، آدمی جری ہو مگر شوخ اور بے شرم نہ ہونا چاہیے، باتونی ہو مگر بکواس نہ کرتا ہو، باوقار اور خاموش ہو، مگر بات کرنے میں عاجز و درماندہ نہ ہو، حلیم ہو مگر بردباری ذلت کی حد تک نہ پہنچے، انتقام لے مگر ظالم نہ بنجائے، سنجیدہ ہو مگر بلید نہ بن جائے، ناقد و مبصر ہو لیکن کسی چیز کے پرکھنے میں خطاکار نہ ہو، پھر جاحظ نے کہا ان ساری باتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر مگر جامع اور بلیغ فقرہ میں کس خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا ہے کہ "خیر الامور اوساطھا"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو جوامع الکلم، فصل الخطاب اور اظہار بیان کا علم عطا کیا گیا تھا،[4]

اگر جاحظ کے اقوال کا استقصاء کیا جائے تو دانائی اور حکمت کی بہت سی باتیں ملیں گی، ابو الفضل کا بیان ہے:

کتب الجاحظ تعلم العقل اولا والادب ثانیا جاحظ کی کتابوں سے پہلے دانشمندی اور پھر علم ادب کی باتیں آتی ہیں۔

(باقی)

[1] کتاب الامالی ج اول ص ۱۳۹ [2] معجم الادبا ج ۶ ص ۵۸ [3] ایضا ص ۸۰ [4] ایضا ص ۷۴

اثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۳ر مارچ ۱۹۴۳ء
حیدرآباد دکن
(جوار الجامعۃ العثمانیہ)

سیدی الکریم! زادکم اللہ عرفاناً وقرباً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً ہم زمینیوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یوں بھی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں، اور عمر عزیز کے چہل سال کے بعد مولانا تھانوی کی ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کا واقعہ یاد آیا، خلافت کے زمانہ میں لباس کی قیمت چند درم سے آگے نہ بڑھی، پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی ولایت کی پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبدالملک سے شادی کی پوری ہوئی، خلافت کی پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی باری ہے، صرف اس کا سامان ہے، آپ نے بھی وہی کیا، اور خوب کیا، لمثل ھذا فلیعمل العاملون ۔ بارک اللہ فیکم وعلیکم۔

لیکن عریضہ نیاز کے ساتھ اتنی بے اعتنائی کرنے کے باوجود جواب سے محروم رکھا گیا،

رسید کی خبر بھی غیر کے ہاتھوں پہنچائی گئی، اور یہ دار المصنفین کی رکنیت کا کیا قصہ ہے، بجب کے ملنے سے پہلے اس کا علم بھی کسی ذریعہ سے نہ ہوا، سمجھ میں نہ آیا کس خصوصیت کو میرے اس انتخاب میں دخل ہے، نظرِ عنایت نگاہِ کرم کے سوا اور کس چیز کا تصور کروں، حسب الحکم دستخط کر کے واپس بھیج رہا ہوں،

"محضرنامہ" کو شروانی صاحب کے پاس آپ نے روانہ نہیں فرمایا، ان کا خط آیا تھا کہ انتظار ہے، مگر آیا نہیں، نہ بھیجا ہو تو اب بھیج دیجئے، جہاں تک عجلت ممکن ہو کرنا چاہیے کہ ع آفتہاست در تاخیر طالب را زیاں دارد - اور کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، آپ کو اور مولانا عبدالباری کو دیکھتا ہوں، تو یہ شعر یاد آتا ہے " یاران تیزگام نے محمل کو جالیا + ہم ...... (؟)

اور کیا عرض کروں، مولانا عبدالباری کا حال حدود رشک سے بھی آگے نکل گیا، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے خاصے صاحب دل بزرگ ہیں، کثر اللہ امثالھم۔

دیکھئے دارالمصنفین مجھے اپنی رکنیت کے بعد بھی اپنے اندر آنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اب تک تو ع تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی کے ساتھ ہی ڈانٹ بتاتا رہا ہے۔ موازنہ دیکھ کر بحمد اللہ طبیعت خوش ہو گئی لیکن یہ دارالمصنفین کا قومی اجتماعی خزانہ ہے۔ ہمارے احباب میں تو ایسے متعدد حضرات ہیں جن کے شخصی دفائن اس سے اضعافاً مضاعفۃ بڑھے ہوئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے، ساری زندگی اس تمنا میں کٹ گئی، لیکن اللہ میاں نے اس تجربہ کا موقعہ نہ دیا، میں نے کبھی عرض کیا تھا کہ معاشیاتی مسائل کے متعلق کچھ چیزیں جمع ہو گئی ہیں، پہلے معارف میں بھیجنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو دل سے اتر گیا، مسودہ کو ڈال دیا تھا، حال میں کالج کے مجلہ علمیہ میں مضمون نہیں تھا، بھرتی کے لیے اسی کے ایک باب کو دے دیا تھا، میں نے آپ کے پاس بھجوا دیا تھا، ملا ہوگا، چند چیزیں ادھر خاص تیار ہوئیں،

لیکن ایسے وقت میں کہ ع چوں دورِ خسرو آمد می در سبو نماندہ + کاغذ و طباعت کی دشواریاں
ایسی ہیں کہ اشاعت تقریباً ناممکن ہے۔ فقط

نیاز مند: مناظر احسن گیلانی

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام عرض فرما دیجئے اور مبارکباد، نگرامی صاحب کا ایک کارڈ
میرے قرآنی جنون کے متعلق آیا تھا، جواب تیار کر رہا ہوں، انشاء اللہ بھیجوں گا۔

۵ مارچ ۱۹۴۳ء
حیدر آباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی الامام دمتم بالعافیۃ والسلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"الحمد للہ الذی اسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ وباطنۃ" لیجئے ایک ہی سال میں
حق تعالیٰ نے ظاہری و باطنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، ہندوستان کے دونوں علمی مرکزوں کو
اتفاق کرنا پڑا کہ جن نیک نیت بزرگوں نے جس نصب العین کو پیش نظر رکھکر ندوۃ العلماء کے
دار العلوم کی بنیاد رکھی تھی بالآخر وہ اسی نتیجہ تک اپنے خرچوں کو پہنچا کر رہا۔ آن واحد میں دیوبند
اور علی گڈھ دونوں نے اس کی تصدیق کی، آپ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، اور ان پاک جانوں
کے نام سے فاتحہ خیر پڑھتا ہوں، جن پر بدگمانیاں کی گئیں، لیکن بالآخر وہی سامنے آیا جو دور اندیشوں
کے اس مقدس گروہ نے سوچا تھا۔ دین کی بھی توثیق ہوگئی، اور علم کی بھی، خدا کرے ندوہ اپنے
نتائج کو آیندہ بھی اسی مثال کا تابع رکھے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

آپ کا گرامی رجسٹرڈ مل گیا، تاخیر کی وجہ سے دل میں وسوسے ضرور پیدا ہوئے لیکن
بحمد اللہ وہ وسوسے ہی تھے۔ مگر آپ نے خاکسار کے معروضہ کو شاید زیادہ توجہ سے نہیں پڑھا،

یا جواب چونکہ دیر میں دینے بیٹھے، اس لیے فقیر نے جو کچھ عرض کیا تھا، اس کا خیال نہ رہا، آپ کی
خدمت میں درخواست جو بھیجی تھی اس کا مطلب تھا خود اپنے دستخط سے اسے مزین فرما کر نواب
صدر یار جنگ بہادر کے پاس حبیب گنج بھیج دیجئے، لیکن آپ نے بجائے دستخط کرنے کے ایک
مستقل سفارش نامہ ارقام فرما کر واپس فرما دیا، نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت
میں آپ کے اس سفارش نامہ کے ساتھ اس درخواست کو خاکسار نے مولانا عبدالباری
کی معیت میں پیش کیا، ان کی رائے بھی یہی ہوئی کہ آپ حضرات کے دستخط کے ساتھ
یہ درخواست اگر پیش ہوگی تو کارروائی میں سہولت ہوگی، فرمائیے کیا دوبارہ خدمت
عالی میں اسے بھیجوں، یا کوئی مصلحت مانع ہے، اگر ایسا ہے تو وہی ارقام فرمائیے، جہاں تک
میں خیال کرتا ہوں، آپ کو کچھ خیال ہی نہ رہا، ورنہ بجائے ایک مستقل سفارش نامہ کے چند
الفاظ کے ساتھ درخواست ہی دستخط کا ثبت کرنا سہل تھا، شاید جذب کا کچھ اثر ہو، خیر
جو کچھ ہوا حق کی مرضی سے ہوا، خیر ہی ہوا، بچیوں کی تقریب سے انشاء اللہ فراغت ہو چکی
ہوگی، فبارک اللہ لکم ولہم، بالرفاہ والبنین،

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ
ورزقکم من الطیبات۔

معلوم نہیں دسنہ میں کب تک قیام رہے گا، اپریل میں میرا کالج بھی انشاء اللہ بند ہوگا،
اگر آپ حسب دستور گرمیوں میں گھر ہی رہے تو قدمبوسی کی سعادت انشاء اللہ حاصل ہوگی،
آپنے تو دیوبندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ کر لیا، اب ہم غریبوں کے پاس کیا رہ گیا، بجز اسکے

تو شاد گشتہ بغرانِ دہی و من بغلامی

خیال آتا ہے اور اس کو آنا چاہیے، لیکن حافظ کان میں کہتے ہیں

تو بہ تقصیر خود افتادی ازیں در محروم | از کہ می نالی و فریاد چرا می داری
اے دلِ خام، شرے ازیں قصہ بدا | کار ناکردہ، چہ امید عطا می داری

اور سچ تو یہ ہے، جیسا کہ میرے چھوٹے بھائی مظہر سلمہ نے کہا کہ "سید صاحب تو ہمیشہ سے وہی تھے جس کی تصدیق مولانا تھانوی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہٗ) نے فرمائی، وہ تو باہر سے زبردستی کچھ دن کے لیے وہ بنے رہے جو وہ نہیں تھے۔"

علی گڈھ کے امتیاز سے تھانہ بھون کے امتیاز کا دل پر زیادہ اثر اور وزن ہے، لیکن بعض روایتوں میں پڑھا ہے۔ "فاروق" کا خطاب فاروق اعظم کو یہودیوں سے ملا تھا، غالب ابن سعد میں ہے، اس سے تسلی ہوئی، آخر علی گڈھ کا گروہ کیا یہودیوں سے بھی زیادہ ہم سے دور ہے،

اللہ اعمی نفلا حکم وصلا حکم

خاکسار مناظر احسن گیلانی

لیجئے یہ بھول ہی گیا، خاکسار کے ہرزہ سرائیوں کی جو مجلہ علمیہ میں شائع ہوئی ہے، آپ نے تعریف فرمائی ہے، معارف کے قابل ان کو سمجھتا تو کیا پہلے نہ بھیجتا، مگر جب زنگی کو کافور آپ قرار ہی دیتے ہیں، تو اشاعت کے لیے پوچھنے کی حاجت ہے؟ اس کے دوسرے اجزا چند متفرق رسالوں میں بانٹ دیے گئے ہیں، شائع ہونے کے بعد خدمتِ گرامی میں حاضر ہوں گے۔

۲۰ راگست ۱۹۴۳ء
حیدرآباد دکن
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی المحترم ادام اللہ مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا جانے آپ کہاں ہیں، دلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈھا، اس لیے ڈھونڈتا تھا

کہ دل کو رو دوں گا، اس یتیمی پر، جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا گئی[1]، مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کو بھوپال میں روک لیا گیا، دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لیے دیوبند گیا تھا، کیا معلوم تھا کہ دیوبند کی مجلس ماتم میں شریک ہونا میرے لیے مقدر ہو چکا ہے، راستہ میں معلوم ہوا تھا کہ آپ بھی بھوپال آئے ہوئے ہیں، غالباً دلی میں، بہرحال آپ کو وہ غم مبارک ہو، جو انشاء اللہ سرمایۂ صد نشاط و سرور ہے، بڑے بلند اختر آپ نکلے، وقت سے پہلے جاگے، ٹھیک جس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، دار العلوم میں جماعت دیوبند کے اس ستون اعظم کے انہدام کی خبر مدرسہ پہنچی، جو بحمد اللہ انہدام نہیں تعمیر ہے، لیکن دنیا والوں کے لحاظ سے انہدام ہی سمجھا گیا، حیدرآباد جب واپس ہوا تو مولانا عبد الباری صاحب کو بہت متاثر پایا، تقریباً نیم جنونی حالت میں، مبارک ہے یہ جنون، خدا ہی جانتا ہے آپ کس حالت میں ہوں گے، خواجہ[2] بیچارے تو مجذوب ہی تھے، سنا ہے کہ کئی دن تک اپنے آپ میں واپس نہ ہوئے، معلوم نہیں اب کیا حال ہے،

اس وقت یہ عریضہ ایک خاص وجہ سے بھی لکھ رہا ہوں، دیوبند سے واپسی کے بعد معارف ملا، دیکھ کر میں نے سر پکڑ لیا کہ ادارہ معارف نے میرے اس مضمون کو جو دار العلوم میں شائع ہوا تھا، معارف میں شائع کر دیا، مخمل میں ٹاٹ کا بخیہ، اور اس پر طرہ یہ ہے کہ دار العلوم والوں نے ایک تو میرے مسودہ ہی کو شائع کر دیا تھا جس کی نظر ثانی بھی نہ ہو سکی تھی، پھر اپنی طرف سے اس مسودہ کے منہ کالا کرنے میں دار العلوم کے کاتب و مصحح نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، کاش اشاعت سے پہلے فقیر کو مطلع فرما دیا جاتا، کم از کم تنبیہ کر دیتا کہ ذرا سنبھل کر پروف اور کاپی کے دیکھنے والے صاحب دیکھیں گے، لیکن غفلت میں انھوں نے بھی لاپروائی سے کام لیا ہے، کہ مضمون نگار کو جتنی تکلیف اور جتنا احساس اپنے مضمون کے اغلاط کا ہوتا ہے، پڑھنے والوں کو

[1] حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی وفات کی طرف اشارہ ہے [2] خواجہ عزیز الحسن صاحبؒ مجذوب سیاسترشد و مجاز حضرت تھانویؒ

اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، لیکن اغلاط کی بھی حد ہوتی ہے، حد یہ ہے کہ فٹ نوٹ کس مقام کا تھا، لیکن ہندسہ کہاں پڑا، سخت تکلیف محسوس ہوئی، علاج غلط نامہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، وہی بنا کر بھیج رہا ہوں، اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو آئندہ نمبر میں اس غلط نامہ کو شائع کر دیا جائے، جو الگ اسی کے ساتھ منسلک ہے، اور کیا عرض کروں، دیوبند سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق بالکلیہ جدا ہو گیا، آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے، ندوہ کا حال نہ معلوم اب کیا ہے، شروانی صاحب سے ملنے علی گڈھ گیا تھا، میرے ساتھ ہی وہ بھی لکھنؤ روانہ ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ آپ بھی لکھنؤ آئیں گے، اچھا ہوا ندوہ سلجھایا جائے گا،

دار العلوم کے شائع شدہ مقالہ کے بقیہ حصے اگر معارف میں آئندہ شائع ہوں تو کسی ناقد بصیر سے اس کی تصحیح کرا لیجئے، آزادی کے ساتھ وہ تصحیح کر سکتے ہیں، میں تو اس مضمون کو معارف کے لائق خیال بھی نہیں کرتا تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حیدر آباد میں، دلی میں جہاں کسی سے ملاقات ہوئی، اکثروں کو دیکھا کہ وہ اس کے مداح تھے، واللہ اعلم کیا بات ہے؛ یہ سچ عرض کرتا ہوں، میرے نزدیک تو اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن جب لوگوں نے پسند کیا ہے، تو خیال ہے کہ اس کے آئندہ حصص جو بالکل ناکمل حالت میں پڑے ہوئے ہیں انھیں درست اور مکمل کر کے خدمت والا میں بھیج دوں گا،

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دار العلوم دیوبند میں عند التعزیت جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی، صدق میں شاید نظر سے گذرے، مولانا مسعود علی ندوی کی خدمت میں سلام فرما دیجئے، تعزیت کے ساتھ انھیں اس مبارک و مسعود حزن و غم کی تہنیت دیتا ہوں، ہر ایک کا مقدر اتنا اونچا نہیں ہے جسے یہ غم نصیب ہو ایسے کہتے ہیں؟ مولانا شاہ معین الدین صاحب کی خدمت میں غیبی سلام عرض ہے۔

نیاز مند مناظر احسن گیلانی

۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء
جوار الجامعۃ العثمانیہ

سیدی الامام! دمتم بالهناء والعیش المدام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت ہوئی ایک عریضہ خدمت والا میں روانہ کر چکا ہوں، معلوم نہ تھا کہ نصیب دشمناں ادھر آپ پھر کچھ بیمار ہوئے، چند دن ہوئے اپنی طویل رخصت سے واپس ہو کر مولانا عبد الباری صاحب حیدر آباد پہنچے ہیں تب معلوم ہوا کہ ادھر آپ کی طبیعت پھر کچھ بگڑ گئی تھی، بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ چل چلاؤ کے اس حال میں مسلمانان ہند کے اندر جن چند نفوس کے دم کو غنیمت خیال کرتا ہوں ان میں آپ تو شاید سب سے زیادہ اہمیت آپ ہی کے وجود گرامی کو حاصل ہو گئی ہے، دست بدعا ہوں کہ آپ صحت عاجلہ سے متمتع ہو چکے ہوں گے، اس وقت اس عریضہ کے لکھنے کی وجہ ایک تو آپ کی عیادت ہے، اور دوسری فوری وجہ معارف کا مضمون "حیات شبلی" کا نمونہ ہے جزاکم اللہ پڑھنے کے بعد بے ساختہ "لعما ھذا انقد قضی ما علیہ" کا جملہ زبان پر جاری ہو گیا اپنے استاد کا حق آپ نے ادا کر دیا، اور واقعی مولانا شبلی مرحوم کا جو حق تھا، اسی کو آپ نے ادا کیا ہے، اغراق و غلو، افراط و تفریط سے پاک، اس قسم کی سوانح عمری خصوصاً اس عہد جاہل میں شاید ہی کسی کی مرتب ہوئی ہو، بلا شبہہ مولانا شبلی قدیم و جدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کیے ہوئے ہیں، لیکن افسوس کہ مضمون بہت جلد ختم ہو گیا، خدا جانے آپ لوگوں کا کیا قصد ہے، متعدد بار جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے سے یہ لکھوا چکا ہوں کہ دار المصنفین کی ہر کتاب شائع ہونے کے ساتھ بھیج دی جایا کرے، لیکن نہ حیات شبلی ہی آئی ہے اور نہ تاریخ ترکی، ضابطہ کی شکل میں اگر منگواتا ہوں تو مراسلہ بازی کا ایک طویل سلسلہ چھڑ جائے گا، کیا یہ ممکن ہے کہ مردست حیات شبلی کے دو نسخے میرے نام بھجوا دیجئے، میں دونوں کی قیمت کتب خانے سے وصول کر کے روانہ کر دوں گا،

میں کتب خانے کے نام ہی سے منگواتا، مگر اس میں جھگڑے دفتری پیدا ہو جائیں گے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر اس عریضے کے ملنے کے ساتھ ہی ان دونوں نسخوں کے بھجوانے کا بصیغہ رشد ضروری، دفتر کو حکم دیجئے، تاریخ تر کی تو ضابطہ کی شکل میں منگوا لیجائے گی، بے چینی حیات شبلی کے دیکھنے کی ہے، چند قطرات نے پیاس بھڑکا دی، خصوصاً فہرست نے تو کھلبلی سی باطن میں مچا دی ہے، جب تک پوری کتاب پڑھ نہ لونگا، چین نہیں آئے گا۔

ہاں! صاحب مولانا شبلی مرحوم کے متعلق میرا ایک انفرادی نقطۂ نظر تھا، لیکن

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

یعنی باوجود سب کچھ ہو جانے کے ابتداء میں بھی وہ ملا ہی تھے، بیچ میں بھی ملا ہی رہے، اور مرے بھی ملاگیری کا کام انجام دیتے ہوئے، کسی حال میں ملائیت کے دائرہ سے نہ نکل سکے، ثبوت میں اسی چیز کو پیش کرتا تھا، جس کا ذکر سوانح میں کیا گیا ہے، کہ مقلدیت و غیر مقلدیت، شیعہ و سنی، رد آریہ، رد عیسائیت ساری زندگی ان کی ان ہی ملایانہ شغلوں میں گذری، اگرچہ دنیا انھیں مورخ، شاعر، لیڈر، تعلیمی ماہر وغیرہ وغیرہ سمجھتی رہی، اور میں ملائیت کے ساتھ کمال وفاداری کی دلیل اسے خیال کرتا ہوں، انھوں نے ملاؤں ہی سے سکھا تھا، جو کچھ سیکھا تھا، ان ہی سے پڑھا تھا جو کچھ پڑھا تھا، اسی لیے ساری زندگی ان ہی کے آستانوں پر لباس بدل بدل کر گھومتے رہے، کسی موقع پر آپنے ان کی تحریر کے یہ الفاظ کہ "میں عقیدۃً بھی حنفی ہی ہوں اور عملاً بھی"، ان کی زندگی کی یہ آخری تحریر جسے کسی نمایش پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور بھی ملائیت پر ان کے مہر لگا دیتی ہے، بہرحال جس طریقہ سے آپکے قلم نے اس کو پیش کیا ہے، دل حکم کرتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی وہ کامیاب رہیں گے، مجھ پر تو ان حالات کے پڑھنے سے جنھیں ابتک پڑھ چکا ہوں، یہی اثر پڑا ہے کہ کان رجلاً یحب اللہ و رسولہ اور راہ قلندری کا پروانہ راہ داری صرف یہی ہے

کفر کافر را و دیں دیندار را ۔۔ ذرہ درد دل عطار را۔

نیازمند۔ مناظر احسن گیلانی

۲۸ اگست سنہ ۱۹۴۴ء
دار الجامعۃ العثمانیہ
حیدر آباد دکن

مخدوم و محترم سیدی و سید المسلمین دمتم بالخیر والعافیۃ علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

من غیر ترقب آپ کا لفافہ پرسوں ملا، پڑھکر مسرت ہوئی کہ بخیر و عافیت آپ دلیسنہ سے اعظم گڈھ تشریف لے آئے، اس کا افسوس ہوا کہ شاہ معین الدین صاحب فرلسٹ ہیں، جو آپکے نہ ملنے سے تو ضرور ہوا تھا کہ "شیخین" کی باتیں آپنے بھی پسند فرمائیں ابھی ہاں کاغذ کی وجہ سے بڑی کھلبلی مچ گئی، آپ لوگوں کا تو سارا کاروبار اسی کاغذ کی ناؤ پر جاری ہے، خدا کرے کوئی صورت استثنا کی دار المصنفین کے متعلق نکل آئے، مگر جو تقریر میں نے حال میں صاحب حیدری کی اس مسئلہ کے متعلق پڑھی اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت بھی کچھ مجبور سی نظر آتی ہو، درآمد ہی بہت کم ہے، لیکن ماشاء اللہ آپ حضرات اثر والے لوگ ہیں، کوئی صورت خدا کرے نکل آئے سالار طائفہ انشاء اللہ کوئی مخلص نکالیں گے،

حسب ارشاد میں نے رضوی کے معاملہ کی تحقیق اسی دن کرائی یعنی مولانا فضل حق صاحب جو اس سے کافی واقفیت رکھتے ہیں، ان کو رضوی کے پاس بھیجا، آج مولانا نے یہ خبر مجھے سنائی ہے کہ براہ راست ان سے وہ ملا اور کہا کہ آج ہی اس نے آپ کی خدمت میں خط بھی بھیجا ہے اور روپیہ بھی حسب الوعدہ اس نے بیان کیا کہ آج بذریعہ بیمہ روانہ کر چکا ہے، یا روانہ کرے گا، ایسی صورت میں بجز انتظار کے اور کیا کر سکتا ہوں، مولانا فضل صاحب سے میں نے کہا ہے کہ رضوی کو براہ راست مجھ سے ملنے کے لیے کہیے وعدہ تو آنے کا کیا ہے، اس سلسلہ میں بس یہی کارروائی کی گئی ہے، خدا کرے جو کچھ اس نے کہا ہے وہی کیا بھی ہو،

آپکے دفتر میں "الدین القیم"[1] اور "تعلیم و تربیت"[2] والی دونوں کتابیں پہنچ گئیں، دیکھیں آپ حضرات کی رائے کیا ہوتی ہے، معاشی مضامین کے متعلق آپ نے پہلے بھی لکھا ہے اور اب کی بھی کہ یہ کر دو، میں اپنا حال کیا عرض کروں، جسے آپ نے قلم کا شباب لکھا ہے وہ میری خبطگی کی ایک حالت ہے، ایک دفعہ

---

[1] مولانا کی تصانیف

جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا، اب پھر اس پر نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہے، آپکے یہاں فنِ تصنیف کے طلبہ کی ایک تعداد تو ہمیشہ رہتی ہے، کیا ان ہی حضرات میں کسی کو آمادہ فرما سکتے ہیں، کہ خرافات کو حذف کر کے کار آمد اجزا، کا انتخاب کر لیں، بہر حال آجکل تو چند دوسرے مشغلوں میں تدوینِ فقہ پر ایک مضمون پڑھا تھا، دوبارہ اس کو مرتب کر کے لکھنے لگا، تو اس نے بھی کتاب ہی کی شکل اختیار کر لی ہے، ابتدائی سو صفحات اس کے جامعہ عثمانیہ کے تحقیقاتی مجلہ میں ایک سال ہوا چھپنے کے لیے دیا تھا مضمون چھپ تو گیا ہے، لیکن دس پانچ صفحہ ایک صاحب کے مضمون کا باقی ہے، سرکاری کام ہے کب نکلتا ہے، ایک کاپی اس کی اسی ہفتہ میں انشاء اللہ تعالیٰ خدمتِ والا میں حاضر ہوگی، اور بھی چند کام جاری ہیں، شاید وقت پورا ہو رہا ہے، جو کچھ اس عرصہ میں نکلا تھا، اگلوایا جا رہا ہے، امید وار دعا و توجہ ہوں، مولانا عبد الباری کی حالت دن بدن بہت زیادہ قابلِ رشک بنتی جا رہی ہے، میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پا رہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں،

معلوم نہیں اب ندوہ کی کیا حالت ہے، مولانا عبد الحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے متعلق آپ یہاں موجود ہی تھے، جب کارروائی ہوئی تھی، مہینوں گذر گئے، لیکن جس حال میں چھوڑ کر ہم لوگ گئے تھے، آنے کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی وہیں ہے، یعنی مسودہ کے منگوانے کی کارروائی تک نہ ہو سکی، اب مجھ سے پتہ دریافت کیا گیا ہے، دیکھئے کب کشتی کنارے لگتی ہے، فقط

نیاز مند مناظر احسن گیلانی

مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض ہے، انکے حکیمانہ ظرافت آمیز فقرے بہت یاد آتے ہیں، اللھم ایدہ وانصرہ علی مشلقہ ائکاغذی جہاد کا لے دے کے یہی ایک اڈہ رہ گیا تھا، لیجئے اس پر لائسنس لگ گیا، "تبلیغیہ" ہی پر اب عمل کیا جائیگا، ورنہ صورت ہی کیا باقی رہی، مولانا عبد الباری بڑے خوش ہیں، اور خوش ہونے کی بات تو مولانا مسعود علی کیلئے بھی ہونی چاہیے، لیکن کاش بصورت اور کوئی ہوتی، بہر حال "کاغذی ناؤ" کے ملاحوں کے امتحان کا بھی تو وقت آگیا، اس طوفان میں اپنی کشتی "ساحل" تک بخیر و سلامتی کون پہنچاتا ہے؟

ادبیات

تمنائے حضوری

از

زائر حرم جناب حمید صدیقی لکھنوی

اک تشنۂ دیدار پہ ہو جائے کرم اور
اک بار بلا لیجئے اے شاہِ امم اور

کچھ اس لیے رکھتے ہیں وہ محروم کرم اور
ہو جائے دل اپنا ابھی شائستۂ غم اور

بس ایک تمنا ہے یہ اے شاہِ امم اور
وہ خلدِ نظر، ایک نظر دیکھ لیں ہم اور

جو خاک کہ سرکار کے قدموں میں لگی تھی
آنکھوں سے لگائیں وہی پھر خاکِ قدم اور

حسرت ہی نہیں کچھ دلِ دیدار طلب کی
طیبہ کے سوا شوقِ فراواں کی قسم اور

وہ سامنے ہے بارگہِ سرورِ کونین
اے راہروِ کوئے حرم چند قدم اور

کعبے کی ہے کیا بات، مگر کوئے نبی میں
ہے بات ہی کچھ دیدۂ حیراں کی قسم اور

ہاں پاسِ ادب اے شرف اندوزِ زیارت
ہٹ کر درِ اقدس سے ذرا چند قدم اور

جس درجہ ہمیں ہوگی گناہوں پہ ندامت
ہوں گے اسی نسبت سے وہ مائل بکرم اور

یوں بھی کرمِ خاص کے قابل نہ تھے لیکن
مایوس کیے دیتے ہیں دنیا کے ستم اور

اب حج و زیارت پہ بھی ہے قیدِ تعین
ہم ہجر کے ماروں کو ہوا ایک یہ غم اور

تجدیدِ تمنا نہ کریں پانچ برس تک
ارباب تمنا پہ ہے یہ تازہ ستم اور

پہنچائے صبا جاکے حضورِ شہِ کونینؐ
اک آخری پیغام یہ از راہِ کرم اور

مل جائے پھر اک بار ہمیں اذنِ حضوری
حاضر ہوں سلامی کو درِ پاک پہ ہم اور

مشتاق ہیں کچھ اور حمید اہلِ محبت
ہو نغمہ زن اے بلبلِ بستانِ حرم اور

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہستی کے کم و کیف سے بیگانہ بنا دے
اے چشمِ فسوں گر مجھے دیوانہ بنا دے

اے ساقیٔ میخانہ تری بات تو جب ہے
بے بادہ و ساغر مجھے مستانہ بنا دے

دیوانہ میں ہو جاؤں تو کر ہوش کی تدبیر
جب ہوش میں آجاؤں تو دیوانہ بنا دے

تو شمع ہے جب بزم کی اے نورِ مجسم
قسمت مجھے اس بزم کا پروانہ بنا دے

عنوان کوئی ہو کہ نہ ہو پھر بھی یہ دنیا
چاہے تو حقیقت کو بھی افسانہ بنا دے

میرے لیے دشوار ہے تکمیل جنوں کی
تیرے لیے آسان ہے کہ دیوانہ بنا دے

مدت سے تمنا ہے اسی پھول کی جوہر
گلشن کو نگاہوں میں جو ویرانہ بنا دے

غزل

پروفیسر محمد منشاء الرحمن خاں منشا (ناگپور)

یہ کمالِ شوق ہے اپنا کہ ہے جادۂ دوست
ہم نے ہر ذرہ میں دیکھا ہے جمالِ رخِ دوست

ہم با با ہی کا یہ بھی اک اعجاز ہے
اب نفس میں بھی اکثر آتی ہے خوشبوئے دوست

جان و دل میں گھلنے لگتی ہیں مقدس خنکیاں
یاد آجاتا ہے جس دم سایۂ گیسوئے دوست

تو ملا تو سرمۂ چشمِ بصیرت مل گیا!!
آ تجھے آنکھوں میں رکھ لوں اے غبارِ کوئے دوست

آرزوئے زیست کا کیا جانیے کیا حشر ہو
بے قراری شیوۂ دل، بے نیازی خوئے دوست

لوگ کیوں دیر و حرم کے چکروں میں پڑ گئے
دو قدم تو کوچۂ دل سے تھی راہِ کوئے دوست

منشا، ان کی ذات ہوتی ہے چمن اندر چمن
پا لیا ہے جن سدا مستوں نے رازِ بوئے دوست

نفیرِ عشق

از
جناب حکیم نیر واسطی لاہور

یہ نظم حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر کہی گئی تھی

بشنو از من چوں شکایت می کنم
از نفیرِ نے حکایت می کنم

نالۂ دل گیرِ نے جانم بسوخت
کعبۂ پندار ایمانم بسوخت

صبر از دل رفت و دل بشکست در رفت
رخت سوئے شہرِ دلبر بست و رفت

گل ز باغ حسن او چیدن گرفت
در دیارِ عشق رقصیدن گرفت

خاک راہ جادۂ رومیؒ شدم
مستِ جامِ بادۂ رومیؒ شدم

ہوش رفت از جامِ پیمانِ الست
نالہ گم شد در نیستانِ الست

در جگر سوزِ نہاں آوردہ ام
قونیہ را ارمغاں آوردہ ام

مطبوعات جدیدہ

سرچشمۂ قرآن ۔ از ابو الفدا محمد عبد القادر، صفحات ۴۴۸، کتابت وطباعت بہتر، پتہ حیدر اینڈ سنس، کتب فروش، چار کمان، حیدر آباد دکن

مشہور عیسائی مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل نے سورس آف اسلام کے نام سے ۲۵-۳۰ برس پہلے ایک کتاب لکھی تھی جسکا اردو ترجمہ ۱۹۴۵ء میں نگار کے ایک خاص نمبر میں ماخذ القرآن کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید منزل من اللہ کتاب نہیں ہے، بلکہ اس کی تعلیمات وقصص سب سابقہ کتب سماوی اور جاہلی رسوم سے ماخوذ ہیں، ڈاکٹر ٹسڈل نے قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی نیا اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ انہی اعتراضات کو مرتب طور پر ایک نئے انداز میں دہرایا ہے، جن کو متعدد مستشرقین اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں، اور جن میں سے ایک ایک کا جواب علمائے اسلام دے چکے ہیں، خود معارف میں بھی اس موضوع پر متعدد مضامین نکل چکے ہیں، مگر اب بھی یہ اعتراضات کسی نہ کسی انداز میں دہرائے جاتے رہتے ہیں، اس لیے ضرورت تھی کہ ایک جگہ مرتب اور مکمل طور پر ان تمام اعتراضات کا جواب دیدیا جائے، تاکہ پڑھنے والے کو آسانی ہو، اسی کمی کو ابو الفدا صاحب نے سرچشمۂ قرآن کے ذریعہ پورا کیا ہے، ابو الفدا صاحب نے نہایت دیانتداری سے ڈاکٹر ٹسڈل کے ایک ایک اعتراض کو نقل کیا ہے، اور اس کا نہایت ہی محققانہ اور عالمانہ جواب دیا ہے، کہیں انھوں نے مناظرانہ اور معاندانہ رنگ نہیں آنے دیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف

اعتراضات کی سطحیت معلوم ہوتی ہے، بلکہ اس سے معلومات میں اضافہ اور قلب کو تسکین بھی ہوتی ہے،

آثار لاہور ۔ از سید ہاشمی فرید آبادی صفحات ۱۴۴، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، قیمت للعمر

شہر لاہور اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ہر زمانہ میں علماء، صلحاء، اور شعراء وسلاطین کا مرکز توجہ رہا ہے، اس کی خاک میں نہ جانے کتنے گنجہائے گراں مایہ مدفون ہیں، یہ اپنی تاریخی اور علمی خصوصیات کے لحاظ سے دلی سے کم نہیں ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی قدیم تاریخ پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے جو اپنی تاریخ دانی کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں اس کتاب کے ذریعہ اس کی قدیم تاریخ سے اہل علم کو باخبر کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ارباب سیف وسیاست کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصہ میں صاحبان علم وفضل کا تذکرہ ہے، پہلے حصہ میں اسلامی عہد کی ابتدا سے مغلوں کے حملے تک کے سیاسی حالات کا ذکر ہے، اور دوسرے حصہ میں متعدد شعراء، علماء اور صلحاء کے علمی وعملی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر کشف المحجوب اور صاحب کشف المحجوب شیخ علی ہجویری کے بارے میں کافی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، کتاب کے مفید ہونے کے لیے ہاشمی صاحب کا نام خود ضمانت ہے،

بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم ۔ از عبد اللطیف اعظمی، صفحات ۳۲۰ کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، قیمت للعہ

ڈاکٹر عبد الحق مرحوم کی شخصیت، علم وعمل دونوں کا مجموعہ تھی، ایک طرف وہ بالغ نظر نقاد دیدہ ور محقق اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، دوسری طرف ایک مجذوب مجاہد کی طرح نصف صدی تک اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ہند وپاک میں سرگرداں رہے، انکی علمی وادبی

صلاحیتوں کا شاہکار ان کی محققانہ تصانیف، ان کے گرانقدر مقدمے اور متوازن ادبی تنقیدیں ہیں، اور ان کے عملی کارناموں کا مظہر انجمن ترقی اردو ہند و پاک اور اردو کالج کراچی ہے، ڈاکٹر صاحب کے علمی و عملی کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے، اور اس کی ابتدا عبد اللطیف صاحب اعظمی نے اس مجموعہ سے کردی ہے، ہندوستان کے متعدد مشہور اصحاب قلم نے ڈاکٹر صاحب کے اوصاف و کمالات پر ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد جو مضامین لکھے، ان سب کو عبد اللطیف صاحب نے اس مجموعہ میں بڑے سلیقہ سے جمع کردیا ہے، اور خود بھی ایک مختصر اور جامع مضمون لکھا ہے جس سے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑ جاتی ہے، کتاب ہر کتب خانہ میں رکھنے اور بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

گاندھی اور نہرو کی راہ - از ڈاکٹر سید عابد حسین، صفحات ۲۷۲، کتابت و طباعت عمدہ
ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، قیمت صہ

گاندھی جی نئے ہندوستان کے معمار ہیں، وہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کی ۲۵-۳۰ برس تک رہنمائی کرتے رہے، اور انھوں نے یہ لڑائی اپنی زندگی میں جیت بھی لی، مگر گاندھی جی کی جد و جہد کا محور محض ہندوستان کی سیاسی آزادی تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ نئے ہندوستان کے سماج کا ایک نیا نقشہ اور مذہب و اخلاق کے تحفظ و بقا کا ایک مشن بھی رکھتے تھے، چنانچہ جب ان کو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی اکثریت انکی سیاسی سرگرمیوں میں تو ان کا ہاتھ بٹاتی ہے، مگر ان کے مذہبی و اخلاقی تصورات اور سماجی نصب العین اور اخلاقی و سیاسی خیالات کو اپنانے سے جی چراتی ہے تو کانگریس کی رہنمائی کے ساتھ انھوں نے آشرم میں رہکر اپنا زیادہ وقت ایسے کارکنوں کی تربیت اور اپنی تصانیف پر صرف کرنا شروع کیا جو انکے اخلاقی فلسفۂ زندگی کو سیاسی و سماجی زندگی میں داخل کرسکیں۔

گاندھی جی کی سحر کن شخصیت سے متاثر ہو کر جن ممتاز لوگوں نے ہندوستان کی سیاسی آزادی میں گاندھی جی کا ساتھ دیا ان میں ایک جواہر لال نہرو بھی ہیں، جواہر لال اپنی افتاد طبیعت اور مغربی مزاج و فکر

کے لحاظ سے گو گاندھی جی سے بہت مختلف ہیں، مگر اس کے باوجود گاندھی جی ہمیشہ ان کو اپنا سیاسی وارث سمجھتے رہے، ڈاکٹر عابد حسین صاحب جو ان دونوں شخصیتوں سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور انکی تمام تصانیف کا غائر مطالعہ کیا ہے، اور ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ دونوں کے فلسفۂ زندگی اور سماجی نصب العین اور ایک فلاحی ریاست کے تصورات پر بڑے شگفتہ انداز میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ان دونوں نے نئے ہندوستان کے لیے جو معاشی و سماجی نصب العین کا خاکہ پیش کیا ہے اس کے نقطۂ اتحاد و اختلاف کو واضح کرنے اور ان میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کے قلم سے پیش لفظ ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

رگ جاں - از ڈاکٹر خورشید الاسلام صفحات ۱۱۲، ٹائپ عمدہ، ناشر انجمن
ترقی اردو علی گڑھ، قیمت عہ

ڈاکٹر خورشید الاسلام ایک اچھے نقاد بھی ہیں اور بالغ نظر شاعر بھی، ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا علم تو ان کی نثر کے ذریعہ برابر ہوتا رہا، مگر ان کی شاعرانہ خوبیوں سے کم لوگ واقف تھے۔ رگ جاں ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جو اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے، اس مجموعہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، اور ان کی تمام ہی نظمیں اور غزلیں متانت، سنجیدگی اور شاعرانہ خصوصیات کا اعلیٰ نمونہ ہیں، خاص طور پر ان کے کلام میں معنویت کے ساتھ تشبیہ و استعارات کے استعمال اور الفاظ کی انتخاب میں قدیم و جدید کا بڑا خوشگوار توازن نظر آتا ہے، امید ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں کی طرح ان کی شاعرانہ کلام بھی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

"م - ح"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	
پتہ	....
نام اڈیٹر	دار المصنفین اعظم گڈھ شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	"

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۱ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۳ء - عدد ۴

مضامین